نہ لڑنا سب سے زیادہ کامیاب جنگ ہے۔ مگر
کم لوگ ہیں جو ایسی جنگ لڑنا جانتے ہوں

شمارہ ۲۸
مارچ ۱۹۷۹

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

شمارہ ۲۸ مارچ ۱۹۷۹

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ٦

آپ کی چھت اگر کمزور ہے تو آپ اس کو سیلاب کی زد میں آنے سے روک نہیں سکتے۔ خواہ آپ اس کے خلاف کتنا ہی چیخ پکار کر رہے ہوں

فہرست

اداریہ

الرسالہ کا عربی ایڈیشن، جزئی صورت میں، اس سے پہلے قاہرہ اور بیروت سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ الرسالہ کے خصوصی مضامین کا عربی ترجمہ ماہانہ کتابچہ کی صورت میں دونوں مقامات سے بیک وقت شائع کیا جاتا تھا۔ قاہرہ کا ایڈیشن مصر کے لئے اور بیروت کا بقیہ عرب دنیا کے لئے۔ الرسالہ کے ناظرین کے لئے یہ بات دلچسپی کی ہوگی کہ اب قاہرہ کے ایک بڑے ناشر کی معرفت الرسالہ کے باقاعدہ عربی ایڈیشن کی اشاعت کا انتظام ہوگیا ہے۔ اولاً "الرسالہ" کے نام سے ڈکلریشن حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر مصر میں پہلے سے ایک پرچہ الرسالہ کے نام سے نکل رہا ہے، اس لئے اس نام سے اجازت نہ مل سکی۔ اب مصر کے محکمہ اطلاعات نے المختار الاسلامی کے نام سے اس کی اشاعت کی اجازت دے دی ہے۔ جیسے ہی ادارتی اور تنفیذی امور اجازت دیں گے، ماہانہ رسالہ کی حیثیت سے یہ عربی ایڈیشن انشاء اللہ قاہرہ سے شائع ہونا شروع ہو جائے گا۔

۲۔ ہم کو ایک ایسے معاون کی ضرورت ہے جو اردو، عربی اور انگریزی زبانیں جانتے ہوں اور دفتری کام کے ساتھ ساتھ اسلامی تحقیقی کام میں مدد دے سکیں۔ عمر ۲۵۔۳۰ سال کے درمیان ہونی چاہئے۔ عربی اور انگریزی ٹائپ جاننا ضروری ہے۔ عربی زبان پر قدرت رکھنے والے کو ترجیح دی جائے گی۔ تعلیم، تجربہ اور مطلوبہ مشاہرہ کی تفصیلات کے ساتھ درخواست روانہ فرمائیں۔ مناسب امیدوار کے لئے انشاء اللہ ترقی کے امکانات ہیں (ظفر الاسلام خاں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن خدا کی کتاب ہے۔ اس کا برتر ادب، اس کے بلند مضامین، اس کی ابدی تعلیمات، اس کا اختلاف و تضاد سے خالی ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ خدائی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ قرآن میں ہدایت کا سامان ہے۔ وہ انسان کی اس تلاش کا جواب ہے کہ وہ زندگی کی معنویت کو سمجھ سکے۔ اس کی فطرت جس رہنمائی کو مانگ رہی ہے، قرآن میں وہ اس کو واضح اور مکمل صورت میں پالیتا ہے۔ قرآن اس کے تمام اندرونی سوالات کا جواب ہے۔ مگر یہ ہدایت کسی کو اپنے آپ نہیں مل جاتی۔ اس کو وہی شخص پاتا ہے جس کے اندر حقیقی طلب کا مادہ ہو۔ جو یہ غیر علمی اصرار نہ کرے کہ وہ آنکھ سے دیکھ کر ہی کسی بات کو مانے گا۔ بلکہ وہ بصیرت سے سمجھ میں آنے والی باتوں پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو۔ جو حقیقتِ اعلیٰ (خدا) کے آگے جھک کر اس بات کا ثبوت دے کہ وہ مصنوعی خود پرستی سے پاک ہے۔ جو اپنی کمائی میں دوسرے کا حصہ لگا کر یہ ظاہر کرے کہ اپنی ذات سے باہر پائے جانے والے تقاضوں کو ماننے کے لئے اس کا سینہ کھلا ہوا ہے۔ جو انسانی محدودیت کا اقرار کرتے ہوئے خارجی ہدایت کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہو۔ جو اس سوال کو اہمیت دے کہ موجودہ دنیا کا نامکمل ہونا ایک زیادہ مکمل نظام عالم کی تشکیل کا تقاضا کرتا ہے —— یہ طلب صادق کی علامتیں ہیں۔ ایسے ہی طالبین کے حصہ میں ہدایت آتی ہے اور وہی اس کائنات میں فلاح کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں (بقرہ ۱-۵)

اسلامی زندگی کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے۔ ایک شخص کو جب اس بات کی پہچان ہو جائے کہ اس کائنات کا خالق، مالک اور رب اللہ ہے۔ وہ اُس کو اِس طرح اپنے شعور کا حصہ بنائے کہ اللہ ہی اس کا سب کچھ بن جائے وہ اسی پر بھروسہ کرے۔ اسی سے امید رکھے۔ اسی سے خوف کھائے۔ اپنی زندگی کو ہمہ تن اسی کے رخ پر ڈال دینے کا فیصلہ کرے تو اسی کا نام ایمان ہے۔

ایمان کے بعد چار عبادتوں کو اسلام میں ارکان کا درجہ حاصل ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ یہ چاروں عبادتیں اسلام کے ارکان بھی ہیں اور اسلام کے مطلوب اوصاف کی علامات بھی۔ نماز اللہ کی قربت تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ روزہ صبر کی تربیت ہے۔ زکوٰۃ یہ پیغام دیتی ہے کہ بندوں کے عملی خیر خواہ بن کر رہو۔ حج اسلامی اتحاد کا عالمی سبق ہے۔ یہی چار چیزیں اسلام کا خلاصہ ہیں۔ بندۂ مومن سے اولاً یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے رب کی یاد میں ڈوبا رہے۔ وہ زندگی کے کسی موڑ پر اس کے تصور سے خالی نہ ہو۔ پھر جس دنیا میں آدمی کو دیندار بن کر رہنا ہے، وہاں بہت سے دوسرے لوگ ہیں۔ ان کی طرف سے بار بار تکلیف کی باتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ اگر آدمی اپنے سوا دوسروں کے اعتراف کا مزاج نہ رکھتا ہو۔ اگر وہ دوسروں کو برداشت کرتے ہوئے دوسروں کے ساتھ مل کر چلنے کے لئے تیار نہ ہو تو موجودہ دنیا میں وہ حق کے سفر کو کامیابی کے ساتھ طے نہیں کر سکتا۔

یہ ایمان اور عبادت اگر حقیقی طور پر آدمی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کے اندر وہ خدا پرستانہ زندگی ابھرتی ہے جو مالک کائنات کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔ دنیا میں اس کی ہستی کا ظہور حق اور عدل کا ظہور بن جاتا ہے۔

اس کی سوچ، اس کا اخلاق، اس کے معاملات، سب اللہ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ وہ اپنے اندرونی وجود میں قلب سلیم (شعراء ۸۹) اور خارجی سلوک میں قائم بالقسط (نساء ۱۳۵) کا مصداق بن جاتا ہے۔ یہی دین اسلام ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو سکھانے کے لئے قرآن اتارا گیا۔

قرآن کو قلم کے ذریعہ کتاب کی صورت میں لکھوا کر انسان کے حوالے کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا اہتمام تھا کہ وہ کسی ادنیٰ تبدیلی کے بغیر اگلی نسلوں تک پہنچ سکے۔ قرآن آج مکمل طور پر محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اس کے ماننے والے بھی بے شمار تعداد میں دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں۔ مگر قرآن والی زندگی عملاً کہیں نظر نہیں آتی۔ قرآنی امکانیات اسی طرح بند حالت میں پڑے ہوئے ہیں جس طرح چند سو سال پہلے بھاپ اور بجلی کی طاقتیں بند پڑی ہوئی تھیں۔

ایسا کیوں ہے۔ اس سوال کے جواب کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا، جب تک خدا کی سنتِ امتحان کو سامنے نہ رکھا جائے۔ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں قرآن کو ماننے والے اور قرآن کو نہ ماننے والے دونوں اپنا اپنا امتحان دے رہے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگوں کو یکساں طور پر آزادی حاصل ہے۔ کوئی شخص قرآن کا انکار کر کے گمراہ ہونا چاہے تو اس کو بھی پوری آزادی ہے۔ اور کوئی قرآن کو مان کر عملاً قرآن کے خلاف چلنا چاہے تو اس کے لئے بھی راستہ کھلا ہوا ہے۔ قرآن کو نہ ماننا کسی کے بچاؤ کے لئے عذر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح قرآن کو مان لینا کسی کو حالت امتحان سے مستثنیٰ نہیں کرتا۔ موجودہ دنیا میں جس طرح قرآن کو ماننے یا نہ ماننے کی آزادی ہے۔ اسی طرح اس کو مان کر اس کی تعلیمات پر چلنے یا نہ چلنے کی آزادی بھی ہر ایک کو ملی ہوئی ہے۔ ایک گروہ قرآن کا انکار کر کے جس طرح اپنی گمراہیوں کے لئے آزاد ہے۔ دوسرے گروہ کو اسی طرح قرآن کا نام لیتے ہوئے قرآن کے خلاف عمل کرنے کی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ مسلم قوم بھی خدا کی عدالت میں جانچ کی ٹھیک اسی سطح پر کھڑی کی گئی ہے جہاں دوسری غیر مسلم قومیں کھڑی ہوئی ہیں:

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصٰری والصّٰبئین من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (بقرہ ۶۲)

یوں ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین، جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور کام کیا نیک تو ان کو ہے ان کی مزدوری اپنے رب کے پاس۔ اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھاویں (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

جب تک اللہ کی یہ سنت باقی ہے، یہ امکان بھی باقی رہے گا کہ کوئی گروہ قرآن و اسلام کا نام لے اور عملاً اس طرح رہے گویا قرآن اور اسلام سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ حتیٰ کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزادی یہاں تک ہے کہ ایک شخص قرآن کے عالم اور مفسر کی حیثیت سے نمایاں ہو۔ دنیا کی زندگی میں وہ دین خداوندی کا چیمپین بنے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کی کوئی دینی قیمت نہ ہو۔ وہ آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ دھکیل دیا جائے جنھوں نے قرآن کو سرے سے مانا ہی نہ تھا، جن کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ (۱۹ جنوری ۱۹۷۹)

وہ لوگ جو سو شہیدوں کا اجر پائیں گے

من تمسك بسنتي عند فساد امتي فله اجر مائة شهيد (الحديث)

میری امت میں بگاڑ کے وقت جس نے میری سنت کو پکڑا اس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔

اسلام کی راہ میں لڑ کر اپنی جان دے دینا ایک ایسا عمل ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا انعام ہے۔ مگر بگاڑ کے زمانہ میں اپنے آپ کو سچے دین پر قائم کرنے کا اجر اس سے سو گنا زیادہ بتایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر اپنے آپ کو ایک دن قربان کرتا ہے۔ جب کہ ثانی الذکر کو ہر روز اپنے آپ کو قربان کرنا پڑتا ہے۔

امت کے اندر جب بگاڑ آتا ہے تو اس وقت یہ حال ہو جاتا ہے کہ ایک بگڑے ہوئے مذہب کا نام دین بن جاتا ہے۔ سارے دینی ادارے، تمام دینی اعزازات اسی بگڑے ہوئے مذہب سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ دین کے تمام شعبوں میں ایسے لوگ قبضہ پا لیتے ہیں جو دین کو تجارت بنا چکے ہوتے ہیں۔ خواص اپنے مصالح کی بنا پر اور عوام اپنی جہالت کی بنا پر اسی بگڑے ہوئے دین کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب کوئی بندہ خدا کے سچے اور بے آمیز دین کو لے کر اٹھتا ہے تو سارے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اس شخص کا دین ان کے اپنے دین کو بے اعتبار بنا رہا ہے۔ وہ فوراً اس کے مخالف بن جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رسول خدا والے طریقے کو پکڑنے والا آدمی خود اپنے دینی معاشرہ میں بے جگہ ہو جاتا ہے۔ وہ سب کے درمیان ایک غیر مطلوب شخص بن جاتا ہے۔

بگاڑ کے زمانہ میں یہ ہوتا ہے کہ وقتی اور رسمی عملیات کو لوگ جنت کا ٹکٹ سمجھ لیتے ہیں، اس کے مقابلہ میں سنت رسول کو پکڑنے والا آدمی حقیقی اعمال پر جنت کا مدار رکھتا ہے۔ لوگ مذہبی مناظرے اور سیاسی مجادلے کے مشغلوں کو دینی کارنامہ سمجھنے لگتے ہیں، وہ بتاتا ہے کہ صبر اور قربانی کے طریقوں کو اختیار کرنے کا نام دین ہے۔ لوگ اپنے دنیوی ہنگاموں کو دین کا عنوان دیئے ہوتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ آخرت کے لئے جینے اور مرنے کا نام دین ہے۔ لوگ احبار و رہبان کے دین کو پکڑے ہوئے ہوتے ہیں، وہ خدا اور رسول کے دین کو دین کا مقام دیتا ہے۔ لوگ اپنے بزرگوں کے ارشادات و ملفوظات سے لپٹے ہوئے ہوتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ قرآن و سنت والے دین کو اپنا دین بناؤ۔ لوگ قصے کہانیوں کے ذریعہ اپنا ایک دینی ایڈیشن تیار کر کے اس کی تلاوت میں مشغول ہوتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ اس کے بجائے محکم آیات اور ثابت شدہ سنت رسول پر اپنے دین کی بنیاد رکھو۔ لوگ اپنے طور پر مختلف قسم کی مذہبی موشگافیاں ایجاد کرتے ہیں اور اس کو دین کا قائم مقام بنا لیتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ اس صاف اور سیدھے دین کو اختیار کرو جو خدا و رسول نے بتایا ہے اور جو اصحاب رسول کے ذریعہ ہم کو پہنچا ہے۔

جو شخص اس قسم کا دین بگڑے ہوئے زمانہ میں لے کر اٹھے وہ لوگوں کی نظر میں کافر و مشرک سے بھی زیادہ مبغوض ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ ان کی دینی حیثیت کو بے بنیاد ثابت کرتا ہے۔ اس سے ان کو اپنی قیادت پر ضرب پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس سے ان کے معاشی مفادات درہم برہم ہوتے ہیں۔ اس سے ان کی گدیاں چھنتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس کو ماننا اپنے آپ کو جمے ہوئے مفادات سے محروم کرنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ ایسا شخص ایک طرف عوام کی عافیت کوش زندگی کے لئے تازیانہ بن جاتا ہے اور دوسری طرف خواص کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کے شہ سوارِ اسلام ہونے کو مشتبہ بنا رہا ہے۔ یہ چیزیں اس شخص کو اتنی بے شمار قسم کی مخالفتوں اور مشکلات میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ اس کے مقابلہ میں ایک دن میدان جنگ میں لڑ کر مر جانا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ان مخالفتوں میں سب سے زیادہ شدید مخالفت ان قائدین کی طرف سے سامنے آتی ہے جو دین کے نام پر دنیوی فائدے حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی قیادت کا راز صحیح دین کا علم بردار بننا نہیں ہوتا۔ وہ یہ کرتے ہیں کہ بگاڑ کے زمانے میں پائی جانے والی دینی شکلوں میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ کوئی کسی ادارہ کی گدی پر بیٹھ جاتا ہے، کوئی دینی جشنوں اور تقریبوں میں خطابت کا جوہر دکھا کر مرجع خلائق بن جاتا ہے۔ کوئی دین کو رائج الوقت پیمانوں میں ڈھال کر لوگوں کے درمیان مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ کوئی گزری ہوئی مقدس شخصیتوں کا سہارا لے کر ان کے نام پر اپنا کاروبار چلا رہا ہوتا ہے۔ کوئی دین کے ایسے سستے نسخوں کی کامیاب تجارت کر رہا ہوتا ہے جس میں لوگوں کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ بدلے بغیر جنت کی بشارتیں مل رہی ہوں۔

صحیح دینی دعوت کا اٹھنا اس قسم کے تمام لوگوں کے لئے چیلنج بن جاتا ہے۔ اس کے فروغ میں ان کو اپنا عزت و اقتدار مٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک عرصہ تک عزت و استقبال کے جلو میں رہنے کے نتیجہ میں ان کے اندر ایک قسم کا دینی کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو اور دین کو ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ فطری طور پر وہ ایک ایسے شخص کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو ان کی امتیازی حیثیت کو بے اعتبار ثابت کرے۔ اعاظم و اکابر کی یہ مخالفت سچے دین کے علم بردار کے لئے انتہائی شدید مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ وقت کے دینی حلقوں کی طرف سے اس کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ اس کی بے دینی کے فتوے دیئے جاتے ہیں۔ اس کی معاشیات کو برباد کیا جاتا ہے۔ اس کو ماحول میں بے جگہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے خلاف ہر قسم کی معاندانہ کارروائی کو جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔ اکابرِ قوم کی مخالفت سے اصاغرِ قوم کو مزید جرأت ہوتی ہے۔ بالآخر یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ اپنی قوم کے اندر رہنا اس کے لئے انگاروں کے درمیان رہنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ ان حالات میں فسادِ امت کے وقت سنتِ رسول کو زندہ کرنے کے لئے اٹھنا اتنی بے پناہ مشکلات کا سبب بن جاتا ہے جو سو بار قتل ہونے کے برابر ہے۔ اسی بنا پر آپ نے فرمایا کہ ایسے شخص کے لئے اللہ کے یہاں سو شہیدوں کا اجر ہے۔ جس طرح خدا کی کوئی حد نہیں، اسی طرح خدا کے دین کی راہ میں آگے بڑھنے کی بھی کوئی حد نہیں۔ خدا کا دین گویا دنیا میں رزقِ الٰہی کا ایک عظیم دسترخوان ہے۔ اس رزق کا سب سے بڑا حصہ اسی کو ملتا ہے جو اس راہ میں اپنے کو ملیامیٹ کرنے کے لئے تیار ہو۔ یہ عزت و شہرت کا اسٹیج نہیں، بربادی کے مقامات ہیں۔ ان مقامات کو طے کرنا بلاشبہ سولی پر چڑھنے سے زیادہ سخت ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آدمی دین کو اس کی اعلیٰ سطح پر اس وقت تک پا نہیں سکتا جب تک وہ قربانیوں کی قیمت پر دین کو حاصل کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ وما یلقٰھا الا الذین صبروا و ما یلقٰھا الا ذو حظ عظیم (حم سجدہ ۳۵)

ایک واقعہ دو انجام

تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان سیاسی طاقت، تمدنی ترقی اور علوم و فنون میں دنیا کی تمام قوموں سے بڑھے ہوئے تھے۔ یورپ نے طے کیا کہ اس کو عربی پڑھنی ہے اور مسلمانوں کے علوم سیکھنے ہیں۔ یہی فیصلہ تھا، جو پندرھویں صدی کے اس عظیم واقعہ کا سبب بنا جس کو دنیا یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Rennaissance) کے نام سے جانتی ہے۔ مسلمانوں کے علوم سیکھ کر اور ان میں اضافہ کر کے یورپ اتنا طاقت ور ہو گیا کہ نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ ساری دنیا پر چھا گیا۔

اس واقعہ کے پانچ سو برس بعد یہی صورت حال برعکس شکل میں مسلمانوں کے سامنے تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ یورپ سیاست و تمدن اور علوم و فنون میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ ان کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپی زبانیں سیکھیں اور یورپ کے علوم کو حاصل کریں۔ مگر یہاں نتیجہ برعکس نکلا۔ یورپی طرز کی تعلیم نے ہم کو یورپ کا ذہنی غلام بنا دیا۔ ہم اپنے علیحدہ قومی وجود کو بھول کر یورپ کے رنگ میں رنگ گئے۔

ایک ہی نوعیت کے دو واقعات میں انجام کا یہ فرق کیوں ہے۔ اس کا جواب ذہنیت کے اس فرق میں ہے جو دونوں جگہ پایا جاتا ہے۔ یورپ نے ہمارے علوم کو اس جذبہ کے تحت سیکھا تھا کہ وہ ہمارے ہتھیاروں سے ہم کو شکست دے سکے۔ اس کے برعکس ہم یورپی علوم کی طرف اس لئے بڑھے کہ ہم اس کے نقال بن کر اس کی نظروں میں باعزت ہو جائیں۔ اور جہاں ذہنیت میں اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں انجام میں فرق پایا جانا لازمی ہے۔

مسلمانوں کو ایک ہزار سال تک دنیا میں وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو آج روس یا امریکہ کو حاصل ہے۔ اس وقت جب کہ یورپ پر ابھی قرون مظلمہ (Dark Ages) کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، عرب مسلمان ایک شاندار تہذیب کو وجود میں لا چکے تھے۔ اور اپنی تحقیقات اور یونانی اور دوسرے علوم کے ترجموں کی مدد سے سائنس اور فلسفہ میں دنیا کی امامت کر رہے تھے، اس وقت مسلمان ساری دنیا میں علم اور تہذیب کے تنہا مالک تھے۔ عربی زبان دنیا کی واحد علمی زبان تھی اور ساری دنیا کے لوگ علوم و فنون کے اکتساب کے لئے مسلم مرکزوں (دمشق، بغداد، قرطبہ، غرناطہ) کا اسی طرح سفر کرتے تھے جیسے آج لوگ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ کے شہروں میں جاتے ہیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں جب کہ مسلمانوں کی طاقت عروج پر تھی اور وہ عرب سے بڑھتے بڑھتے فرانس تک پہنچ گئے تھے اس وقت یورپ نے مسلمانوں کے خلاف اپنی شدید ترین جنگ چھیڑ دی اور گیارھویں صدی کے آخر (۱۰۹۶) سے لے کر تیرھویں صدی کے آخر تک دو سو برس پورا یورپ مسلمانوں کے خلاف خوفناک جنگ لڑتا رہا۔ یہ جنگ جو صلیبی لڑائیوں (Crusades) کے نام سے مشہور ہے، بالآخر یورپ کی مکمل ناکامی پر ختم ہوئی۔

مگر یورپ نے ہمت نہیں ہاری۔ اب اس کے اندر ایک نیا رجحان ابھرا۔ صلیبی جنگوں کے درمیان اہل یورپ کو تجربہ ہو گیا تھا کہ مسلمان علم اور سائنس میں ان سے بہت آگے ہیں۔ اس وقت کا تصور کیجئے جب مصری فوج نے منجنیقوں

کے ذریعہ فرانسیسی لشکر پر آگ کے بان پھینکنا شروع کئے۔ یہ بان جب منجنیقوں سے نکل کر دشمن کی طرف بڑھتے تو ایسا نظر آتا جیسے بڑے بڑے آتشین اژدہے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔ فرانسیسی، جن کے پاس اس وقت پرانے دستی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، ان کے لئے یہ بان ایسے ہی بھیانک تھے جیسے آج کسی پس ماندہ اور بے سروسامان ملک پر جدید ترین راکٹوں کے ذریعہ حملہ کر دیا جائے۔ اسی طرح مسلمان تہذیب و تمدن کے تمام پہلوؤں میں نمایاں طور پر اہل یورپ سے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے ناکام تجربہ کے بعد یورپ نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لئے اب اس کو دوسرے قسم کی جنگ چھیڑنی ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہنر اور اُن کے علوم کو سیکھ کر انھیں کے ہتھیاروں سے انھیں شکست دی جائے۔

اب ایک طرف یورپ کے مذہبی طبقہ نے روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusadws) کا نعرہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کو سیکھا جائے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے عقائد کو اس طرح بگاڑ کر پیش کیا جائے کہ مسلمان اپنے دین سے متنفر ہو جائیں اور عیسائیت قبول کرلیں تاکہ وہ قوم جس کو فوجی میدان میں شکست نہیں دی جا سکی ہے، اس کو عددی حیثیت سے کمزور کر کے مغلوب کیا جا سکے۔ عیسائی مشنری تحریک پہلی بار صلیبی جنگوں کے زمانے میں شروع ہوئی۔ پہلا شخص جس نے ۱۱۵۴ء میں ماؤنٹ کارمل پر مشنری نظام قائم کیا وہ ایک صلیبی ہی تھا۔ بعد کو فرانسس کن (۱۲۱۹) نے اس کی پیروی کی۔ یہ مشنری تحریک آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور تبلیغی ادارہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کوششیں اس حد تک کامیاب ہوئی ہیں کہ ساری دنیا کا لٹریچر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط قسم کی باتوں سے بھر گیا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کا فلسفہ و سائنس اور ان کے علوم و فنون سیکھنے کی تحریک زور شور سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یورپ کی درس گاہوں میں عربی زبان پڑھانے کا انتظام کیا گیا۔ مسلمانوں کی تصنیفات کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں کئے جانے لگے۔ یورپ کے طلبہ مسلم شہروں میں تحصیل علم کے لئے جانا شروع ہوئے۔

جنگ کی یہ نئی تکنیک اختیار کرنے کی وجہ سے یورپ کو اندرونی طور پر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت یورپ کے قدامت پسند حلقوں میں عربی زبان کی توسیع کی حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں ناراضگی پائی جاتی تھی جس کی وجہ خاص طور پر یہ اندیشہ تھا کہ عربی سیکھنے سے عیسائیوں کے درمیان اسلامی خیالات پھیلنا شروع ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر فرانسس کن راہب راجر بیکن (۹۴ - ۱۲۱۴) جو اپنے وقت کا مشہور انگلستانی عالم تھا، اس نے جب عربی زبان کی اہمیت پر زور دیا تو آکسفورڈ کے علماء چلا اٹھے "بیکن مسلمان (Saracen) ہو گیا"۔

مگر اس طرح کی مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں کی زبان اور ان کے علوم سیکھنے کا رجحان بڑھتا رہا۔ مسلم محققین کے حاصل کو لے کر یورپ نے اپنی کوشش سے اس میں اضافے کئے اور اتنی ترقی کی کہ تاریخ میں پہلی بار قوت کا معیار بدل دیا اور بالآخر مسلمانوں کو ہر میدان میں شکست دے کر علم و عمل کی پوری دنیا کا مالک بن گیا۔ جدید مورخین نے تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا اہم ترین محرک وہ علوم تھے جو مسلمانوں کی معرفت یورپ تک پہنچے

(ویسٹرن سویلزیشن، اڈورڈ میکنال برن)

اس کے پانچ سو برس بعد تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے۔ یورپ کی ترقی اور عروج سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپ کے علوم و فنون کو سیکھیں۔ مگر یہاں اس رجحان کا محرک اس سے بالکل مختلف تھا جو یورپ کی تاریخ میں ہمیں نظر آتا ہے۔ سر سید احمد خاں (۹۸ – ۱۸۱۷) جو پروفیسر گب کے الفاظ میں اسلام میں پہلی جدت پسند تنظیم (Modernist Organization) کے بانی تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۵ میں علی گڑھ کالج قائم کیا اور اس پر اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ میں وہ یونیورسٹی بن گیا، وہ یورپی طرز کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ان کا مقصد اس تعلیم سے کیا تھا اس کی ترجمانی ان کے رفیق خاص مولانا حالی نے ان الفاظ میں کی ہے:

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں

سر سید نے جب انگلستان سے واپس آکر دسمبر ۱۸۷۰ میں تہذیب الاخلاق نکالنا شروع کیا تو انھوں نے پہلے پرچہ کے شروع میں لکھا:

> "اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں"

سر سید جب ترقی کا تصور کرتے تو ان کے ذہن میں "زرق برق وردیاں پہنے کرنل اور میجر بنے ہوئے مسلمان نوجوان" ہوتے تھے۔ ان کا منتہائے مقصود ایسی تعلیم تھی جو مسلمانوں کو اعلیٰ عہدوں تک پہنچا سکے۔ سر سید کی تہذیب کو مہدی افادی نے بجا طور پر "اینگلو محمڈن کلچر" کا نام دیا ہے۔

کمال اتاترک (۱۹۳۸–۱۸۸۱) جو اس گروہ کا دوسرا نمایاں ترین نام ہے، وہ اس معاملہ میں سر سید سے بھی آگے تھے۔ ترکی میں مغربی تعلیم و تہذیب کی اشاعت سے کمال اتاترک کا مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ اس عنوان سے ہوتا ہے جو اس مہم کو دیا گیا۔ کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک یہ "غرب دوغرو" تھا، جس کے معنی ترکی زبان میں ——— "سمت مغرب میں سفر" کے ہیں۔ سمت مغرب میں سفر کا یہ کام اس درجہ اہم تھا کہ صرف رومن رسم الخط جاری کرنے اور ترکی باشندوں کو ہیٹ پہنانے کے لئے ہزاروں آدمی اس طرح ہلاک کر دیئے گئے گویا وہ ریاست سے بغاوت کے مجرم ہوں۔

اسی تقلیدی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ان مصلحین کی ساری توجہ بس یورپ کی تہذیب اور یورپ کے زبان و ادب کے حصول پر لگی رہی۔ سائنس اور ٹکنالوجی جو مغربی قوموں کی ترقی کا اصل راز ہے، اس کو مسلمانوں کے اندر رائج کرنے کی انھوں نے زیادہ کوشش نہیں کی۔ سر سید نے تو صراحۃً مسلمانوں کے لئے ٹکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت کی اور "اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم" کو سب سے مقدم قرار دیا۔ یہی اس زمانہ میں تعلیم جدید کے حامیوں کا عام نقطۂ نظر تھا۔ ان

حضرات نے ساری توجہ صرف اس پر دی کہ ایک ایسا گروہ پیدا ہو جائے، جو مغربی تمدن اور یورپی ادب میں کمال حاصل کئے ہوئے ہو۔ کمال اتاترک کا نام نہاد انقلاب اور روس کے اشتراکی انقلاب میں صرف چند سال کا فرق ہے، مگر حیرت انگیز بات ہے کہ روس آج خلا میں راکٹ پھینک رہا ہے اور ترکی ابھی تک مغربی مصنوعات کا گودام بنا ہوا ہے۔

یورپ جس ذہن کے تحت ہمارے علوم کی طرف بڑھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں سے ان کے علوم اور ان کے ہنر کو لے کر اس کے ذریعہ سے انھیں شکست دی جائے۔ ان چیزوں کو اس نے وقت کی طاقت سمجھا اور اس کو اپنے دشمن کے مقابلہ میں استعمال کیا۔ چنانچہ اپنی اس مہم کو یورپ نے "تقلیدِ مشرق" یا "تقلیدِ مسلم" کا نام نہیں دیا بلکہ اس کو روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کہا، جس کا مطلب یہ تھا کہ صلیبی لڑائیوں کی ہاری ہوئی بازی کو نئی تکنیک سے کامیاب بنایا جائے۔ اور جب اس کوشش سے وہ اپنے کو ایک نئے انقلاب تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کو انھوں نے یہ حیثیت دی گویا انھوں نے خود اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کی ہے۔ چنانچہ یورپ میں اس نئے انقلاب کا تاریخی نام نشاۃ ثانیہ (Renaissance) رکھا گیا ہے۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ——— نیا جنم (Rebirth) گویا یہ کوئی غیر سے حاصل کی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ یورپ کی اپنی ہی متاع ہے جو اس نے دوبارہ پائی ہے۔ یورپ نے لیتے وقت اگرچہ ان علوم کو مسلمانوں سے لیا تھا، مگر اس نے حال کی کڑی کو حذف کر کے اس کا رشتہ ماضی سے ملایا اور اس کو مغرب کے ایک ملک ــ یونان ــ کی چیز قرار دے کر اس کو نشاۃ ثانیہ کہا۔ اس کے برعکس ہم نے ایسا نہیں کیا، حالاں کہ یورپ جو چیز ہمیں دے رہا تھا وہ اضافہ شدہ حالت میں وہی سرمایہ تھا جو یورپ کو ہم نے عطا کیا تھا۔ مسلمان مغربی علوم کی طرف خالص تقلیدی ذہن کے ساتھ بڑھے ان کا یہ عمل سرسید کے یہاں "پیروئ مغرب" اور اتاترک کے یہاں "غرب دو غرو" کے ہم معنی تھا۔ ذہنیت کے اس فرق کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ یورپ ہمارے علوم کو سیکھ کر ہمیں شکست دے اور اس کے برعکس ہم مغرب کے علوم کو سیکھ کر صرف مغرب کے بھونڈے نقال بن کر رہ جائیں۔

مصطفیٰ کمال کی تحریک کا آخری نشانہ یہ تھا کہ ترک قوم ہیٹ اور پتلون پہننے لگے۔ اور سرسید کا منتہائے نظر یہ تھا کہ مسلم نوجوان مغربی ادبیات میں کمال حاصل کر لیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے ذہن کے تحت مغرب کی طرف بڑھنے کا وہی نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا جو عملاً برآمد ہوا۔

یہ تاریخ جہاں ایک طرف ہماری غلطی کو بتاتی ہے وہیں اس کے اندر اس کا بھی نشان ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہمیں وہی کرنا چاہیے جو مغربی قوموں نے ہمارے ساتھ کیا۔ مغربی علوم کو اس لئے سیکھنا تاکہ اس کے ذریعہ مغربی تہذیب کو شکست دے کر اسلام کو غالب کیا جائے۔ اگر ہمارے اندر یہ ذہن پیدا ہو جائے تو وہی نتیجہ برعکس شکل میں ظاہر ہوگا جو مغربی قوموں کے لئے ہمارے مقابلہ میں ظاہر ہوا تھا۔

جب زندگی اللہ کے رنگ میں رنگ جائے

یہود و نصاریٰ کے یہاں رواج تھا کہ جب ان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا یا کسی نئے آدمی کو اپنے دین میں داخل کرتے تو اس کو خاص قسم کے زرد رنگ میں غوطہ دیتے۔ اس رنگ میں رنگنا ان کے نزدیک آدمی کے خدا پرست اور نجات یافتہ ہونے کا نشان تھا۔ قرآن میں کہا گیا کہ اس قسم کا ظاہری رنگ چڑھا لینے سے کچھ نہیں ہوتا، اپنے باطن کو "رنگین" بنانے کی کوشش کرو:

صبغة اللہ ومن احسن من اللہ صبغة (بقرہ ۱۳۸) اللہ کا رنگ، اور اللہ سے بہتر کون رنگ ہے۔

گویا دین کسی ظاہری رنگ کا نام نہیں بلکہ معنوی رنگ کا نام ہے ——— وہ دین جو اعضاء و جوارح کی سطح پر اٹکا ہوا ہو، جو رسمی عملیات کو دہرانے کے ہم معنی ہو۔ جو آدمی کے لئے خارجی امور میں بحث و مباحثہ کا موضوع ہو، جو دوسروں کے خلاف شور و غل کا پروگرام دیتا ہو۔ جو جلسوں اور جلوسوں اور اخباروں کی سطح پر نمایاں ہونے کا عنوان ہو، وہ گویا ظاہری اصطباغ کا دین ہے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے جسم کو اوپر سے "زرد رنگ" میں رنگ لیا اور اندر کا حقیقی وجود بدستور بے رنگ پڑا رہا۔

اصل دین وہ ہے جو آدمی کے اندر ہل چل پیدا کر دے، جو آدمی کے دل و دماغ میں آگ لگانے والا ہو۔ جو آدمی کے اندرونی وجود کو خدا کے رنگ میں رنگ دے۔ پہلی قسم کا دین آدمی کے اوپر اوپر رہتا ہے۔ جب کہ اصل دین آدمی کی حقیقی ہستی میں شامل ہو جاتا ہے۔ پہلی قسم کے دین میں ایک شخص کچھ چمتکار دکھا کر یا بعض عملیات کر کے سمجھتا ہے کہ وہ دیندار بن گیا۔ جب کہ اصل دین اس کے اندرونی احساسات سے لے کر اس کی آنکھ اور زبان اور ہاتھ اور پاؤں تک ہر جگہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو بالکل دوسرے قسم کا انسان بنا دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے دین میں آدمی کی اصل ہستی اور اس کا دین دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ جب کہ اصل دین میں دونوں ایک دوسرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ نہ دین اس سے جدا رہتا ہے اور نہ وہ دین سے۔

صحیح مذہب وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں اسی طرح شامل ہو جائے جیسے پانی میں رنگ شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ مذہب بناوٹی مذہب ہے جو آدمی کی اپنی زندگی سے باہر باہر نجات کے عملیاتی راستے بتائے۔ خواہ وہ سیاسی عملیات ہوں یا نام نہاد روحانی عملیات۔

علمائے نفسیات ذہنی اختلال کے وقت آدمی کے لاشعور کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی طرح اوپری رنگ اور حقیقی رنگ کو جاننے کا وقت وہ ہوتا ہے جب کہ کوئی ایسا ناخوش گوار واقعہ پیش آئے جس سے آدمی کے نفس کو چوٹ لگے۔ اگر وہ سچا ہے تو ایسے وقت اس کے اندر سے تواضع ابھرے گی کیونکہ خدا پرستی کی حقیقت تواضع ہے۔ اس کے برعکس اگر جھٹکا لگنے کے وقت اس کے اندر نفرت، کبر اور انانیت ابھرے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا دین محض اوپری رنگ کا دین تھا جو معمولی آنچ لگتے ہی اڑ گیا۔ ■

ISLAM IN BRITAIN

Mr. Ahmed Thomson, a member of the British *Sufis*, who are setting up a Muslim Village outside Norwish in the United Kingdom has expressed the following views—

(1) The resurgence of Islam in the UK particularly and in the West generally, is the fulfilment of the promise given by the Holy Prophet of Islam, peace be on him, **that Islam will have a revival every hundred years.**

(2) We are in 1398 Hijra and within two years we will be entering the 15th century Hijra, when *Insha Allah*, **Islam will have its biggest revival in the West ever.**

(3) Unless there are more Muslim Barristers in the UK we can't change the law here. Law here is subservient to Parliament while **for a Muslim, law is subservient to Allah** and is to be guided by Allah's words as revealed in the Holy Quran and explained and expanded in the *Hadith* and *Sunnah.*

(4) As their own faith and religion has failed to solve their problem, non-Muslims listen carefully to what Islam has to offer and very often they come to the fold.

(5) The Prophet's forecast is coming true. The day Franco died two Spaniards came to Shaikh Abdul Qadir and said they wanted to return to the religion of their forefathers—Islam. They embraced Islam and stayed at the centre for a whole year to learn all about Islam in detail and have since returned to Cordova where they have set up an Islamic Centre and now there are 25 Spanish Muslims in Cordova and they have even set up a mosque there. That's the beginning; **Islam is spreading in Spain once again.**

Mr. Ahmed Thomson once belonged to the Church of England. He embraced Islam a couple of years ago and since then has been to Haj as well. He is hardly 25 and is reading law at Grey's Inn. He belongs to the group of British Muslims who were converted to Islam by Sufi Abdul Qadir—an English man—who had set up a centre for British Muslims (converts) at Maida Vale in London, a sort of Islamic commune or kibbutz.

British Muslims are pure, unadulterated, no nonsense, Muslims. They lead a self-sufficient-life and strictly adhere to Islamic dictates; they dress in flowing robes and wear *'Ammaama*. Their women and girls also cover their heads all the time and wear long robes. They also publish a magazine called ISLAM.

There are now in the Village over 40 English Muslims, men, women and children, and they have set up a Madresa where English children (five or six) are being taught the Holy Quran.

The Caliph of the commune is Abdus-Samad, who speaks very good Urdu as he was in Lahore some years ago. He too is an Englishman.

They have set up a mosque in an old hall; it is called Ihsaan Mosque.

* * *

Islam on British T.V. (By Yahya M. Syed, Reproduced from Dawn, Karachi of September 10, 1978.)

I couldn't believe my ears and eyes when I heard the question master asking two groups of students, one of non-Asians or immigrants, and another of English non-Muslims, who was the first caliph of Islam and who was the last. And an English girl, correctly answered both the questions. The Quiz Master, Keith Macklin, then went on to ask about the different Islamic schools—Sha-fi-'ee Hambli, Malcki and (*Hanafi*), and an English boy gave the answers correctly.

The boys and girls, all in their teens, in the quiz programme were shown photographs of the Blue Mosque in Turkey and were asked who built it. No one knew—Sulaiman, the magnificent, said Keith Macklin. Other photographs included Masjid-e-Aqsa and other well known mosques in Baghdad and elsewhere.

Then he asked who was killed at Karbala, the question was asked in stages, giving more details at every stage, but in the end a girl got the correct answer, Hasan, she said, which the Quiz Master corrected: Hussain and awarded her one point for the effort! Questions of the same standard and tenor followed thick and fast till the final gong. The score was 26 to 22.

I looked at the programme for all the 25 minutes it lasted. It was "Junior Sunday Quiz", a Yorkshire TV Production and shown on the Independent Television during the weekend.

It was the second-round contest of religious competition on Islam. Full marks to the producer of the Quiz programme, Tony Scott, and its researcher Jane Aldrick. I only wish the press officer of either Yorkshire TV or ITV had realized the importance of the programme and given advance publicity in the Press. It could have had a top viewing rating.

Only a year ago I could not imagine that a question and answer programme on Islam and Islamic history would be screened on British TV in which English boys and girls would be participating with a zeal, and keenness that would put many modern Muslims to shame!

یحییٰ سید کا ایک مضمون اخبار ڈان کراچی (۱۰ ستمبر ۱۹۷۸ء) میں چھپا ہے۔ وہ اپنے لندن کے سفر کے تاثرات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مجھے اپنے آنکھ اور کان پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں برٹش ٹیلی وژن پر بچوں کے سوال و جواب کا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ "اسلام کا پہلا خلیفہ کون تھا"، سوال کرنے والے مسٹر کیتھ میکلن نے پوچھا۔ ایک غیر مسلم انگریز لڑکی نے بالکل صحیح جواب دیا۔ اس نے پھر مختلف فقہی مکاتب کے بارے میں سوالات کئے اور دوبارہ ایک انگریز لڑکا کا نہایت صحیح جواب دیتا رہا۔ یہ سب لڑکے لڑکیاں ۱۰ سال اور ۲۰ سال کے درمیان کی عمر والے تھے۔ سوال کرنے والے نے پوچھا: کربلا میں کون شہید ہوا۔ جوابات صحیح تھے صرف اس فرق کے ساتھ کہ لڑکی نے حسین کے بجائے حسن کا نام لیا۔ آخر میں اعلان ہوا تو معلوم ہوا کہ ٹونی اسکاٹ نے پورے نمبر پائے۔ ٹیلی وژن پر اس قسم کے اسلامی پروگرام کو دیکھنے والوں کی تعداد یہاں تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک سال پہلے تک اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مسٹر احمد ٹامسن ایک انگریز نومسلم ہیں۔ یہ "برٹش صوفی" حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کو ایک انگریز نومسلم "صوفی عبدالقادر" نے قائم کیا ہے۔ ان لوگوں نے انگلستان میں ایک مسلم بستی بنائی ہے جس میں چالیس سے اوپر نومسلم انگریز رہتے ہیں۔ مسٹر احمد ٹامسن نے کہا کہ اسلام دوبارہ دنیا کی طاقت بننے والا ہے۔ انھوں نے یورپ میں اسلام کے پھیلنے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ اسپین میں جب جنرل فرینکو کا انتقال ہوا تو دو اسپینی باشندے صوفی عبدالقادر کے پاس آئے۔ انھوں نے اسلام قبول کیا۔ ایک سال تک انگلستان میں رہ کر انھوں نے اسلام کی تعلیمات کو سیکھا۔ اس کے بعد وہ اسپین گئے اور وہاں قرطبہ میں اسلامک سنٹر قائم کیا۔ ان کی کوششوں سے اب تک پچیس اسپینی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ انھوں نے قرطبہ میں ایک مسجد بھی بنالی ہے۔ اسلام دوبارہ اسپین میں اپنی تاریخ شروع کر رہا ہے۔

برطانیہ کے یہ نومسلم خود کفیل زندگی گزارتے ہیں وہ پوری طرح اسلام پر عمل کرتے ہیں۔ وہ عمامہ پہنتے ہیں ان کی عورتیں اور لڑکیاں اپنے پورے سر کو ڈھکے رہتی ہیں ان کا ایک میگزین بھی نکلتا ہے جس کا نام "اسلام" ہے انھوں نے اپنی بستی میں ایک اسلامی مدرسہ بھی بنایا ہے جس میں بچوں کو قرآن پڑھایا جاتا ہے۔

امریکی فلسفی رالف والڈو ایمرسن (۱۸۰۳-۱۸۸۲) نے اپنے زمانہ کی امریکی جماعتوں کے بارہ میں کہا تھا:

Our parties are parties of circumstances and not of principle

ہماری جماعتیں محض حالات کی پیداوار ہیں۔ وہ اصولی جماعتیں نہیں ہیں۔ یہی بات آج کی ہندوستانی جماعتوں پر صادق آتی ہے۔ حتیٰ کہ خود ملی اور اسلامی جماعتیں بھی بڑی حد تک اسی کا مصداق ہیں۔ ہماری تحریکیں وقتی حالات کے تحت اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مثبت فکر اور مستقل ذمہ داری کے احساس نے ان کو پیدا نہیں کیا۔ یہ تحریکیں اگر مستقل ذمہ داری کے احساس کے تحت وجود میں آتیں تو وہ دعوتی تحریکیں ہوتیں نہ کہ ہماری موجودہ تحریکوں کی طرح سیاسی اور احتجاجی تحریکیں۔

اللہ کے یہاں دونوں برابر نہیں ہو سکتے

اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن آمن باللہ والیوم الآخر وجاھد فی سبیل اللہ لا یستوٗن عند اللہ واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ واولٰئک ھم الفائزون یبشرھم ربھم برحمۃ منہ ورضوان وجنٰت لھم فیھا نعیم مقیم (توبہ ۲۱ – ۱۹)

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی خدمت کرنے کو اس شخص کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا۔ جو لوگ کہ ایمان لائے اور جنھوں نے گھر چھوڑا اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ان کا درجہ اللہ کے یہاں بہت بڑا ہے اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب ان کو خوش خبری دیتا ہے اپنی طرف سے رحمت اور رضامندی کی اور ایسے باغوں کی کہ ان میں ان کے لئے دائمی نعمت ہوگی۔

کعبہ، اسلام کے ظہور کے بہت پہلے سے تمام عربوں کے نزدیک مقدس چلا آرہا تھا۔ صدیوں کی تاریخ نے اس کی عظمتیں لوگوں کے دلوں میں قائم کر دی تھیں۔ اس سے معمولی انتساب بھی ایک قابل تذکرہ چیز سمجھا جاتا تھا۔ کعبہ کی زیارت اتنا مقدس عمل تھا جس کو آدمی فخر کے ساتھ بیان کر سکتا تھا۔ کعبہ کا خادم اور منتظم ہونا ایک ایسا مسلّمہ اعزاز تھا کہ جس کو حاصل ہو جائے اس کو وہ قوم کا سردار بنانے کے لئے کافی ہو۔ مکہ کے مشرکین کعبہ کی انھیں پرفخر روایات کے اوپر کھڑے ہوئے تھے۔ کعبہ سے انتساب اور اس کی زیارت وخدمت نے ان کو لوگوں کی نظر میں محترم بنا دیا تھا۔ وہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ اس کے باہر بھی فضل وشرف کا کوئی درجہ ہے جو کسی کو خدا کی طرف سے عطا کیا جائے۔

دوسری طرف اسلام تھا جس کی ابھی کوئی تاریخ نہیں بنی تھی۔ جس کے گرد ابھی تک عظمتوں کی روایات جمع نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی تصویر لوگوں کی نظر میں یہ تھی کہ ——— ایک یتیم جو ابھی تک بکریاں چراتا تھا، اپنے ذاتی حوصلوں کے تحت داعیٔ حق بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور کچھ لٹے پٹے لوگ اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ایک، دیکھنے والوں کو قوم کے اصاغر کا وقتی مجمع نظر آتا تھا۔ دوسرا، قوم کے اکابر کا شاندار قافلہ جو عزت وشرف کی ابدی مسندوں پر جلوہ افروز ہو۔

مکہ کے لوگ اپنے آپ کو کعبہ کی عظمتوں کے جلو میں پاکر مطمئن تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی دینی حیثیت مسلّم ہے۔ ان کی خدا پرستی میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں۔ مگر خدا کے یہاں ایسی دینداری کا کوئی اعتبار نہیں جس کے ساتھ دنیوی عزتیں اور مادی ترقیاں وابستہ ہو گئی ہوں۔ جو دین تجارت بن گیا ہو، وہ کسی کی خدا پرستی کو جانچنے کا

معیار کیسے بن سکتا ہے۔ خدا پرستی تو ایسے دین کے ساتھ جانچی جاتی ہے جو دنیا کی چمک دمک سے خالی ہو۔ خدا ایک غیبی حقیقت ہے اور وہ ہمیشہ غیبی روپ میں انسان کے سامنے آتا ہے۔ خدا پرست وہ ہے جو خدا کو اس کی غیبی صورت میں پالے۔ وہ یتیم چہر دا ہمہ کے اندر چھپے ہوئے داعیٔ حق کو دیکھ لے۔ وہ ایک انسان کی زبان سے ادا ہونے والے کلمات میں خدا کی آواز کو پہچان لے۔ وہ معمولی آدمیوں کے ساتھ چلنے والے فرشتوں کی آہٹ کو سن سکے۔ مکہ کے لوگ انتظام حرم اور خدمت حجاج جیسے نمائشی کام کرکے خدا پرستی کے چیمپین بنے ہوئے تھے۔ ان کو خبر نہ تھی کہ عالم الغیب جہاں خدا پرستی کا کریڈٹ دینے کے لئے ان کا انتظار کر رہا ہے وہ دوسرا مقام ہے اور وہ وہی ہے جس کو غیر اہم سمجھ کر انھوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کی خدمت کرنا بجائے خود ثواب کے کام ہیں۔ مگر اس وقت کے تاریخی حالات میں وہ مکہ والوں کے لئے کام سے زیادہ اعزاز بن چکے تھے۔ وہ اس کے ذریعہ بیک وقت دینداری کا شرف حاصل کر رہے تھے اور اسی کے ساتھ عزت و اقبال کی گدیاں بھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے والوں کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ ان کے لئے دین داری عملاً اپنے آپ کو بربادی کے راستہ پر ڈالنے کے ہم معنی تھی اول الذکر کو دین کے نام پر عزت و جاہ کا تمغہ ملتا تھا۔ ہر قسم کی دنیوی سہولتیں فراہم ہوتی تھیں۔ یہ تسکین حاصل رہتی تھی کہ ہماری دین اور دنیا دونوں محفوظ ہیں۔ جب کہ ثانی الذکر کے لئے دین ایک سراپا جان جوکھم کا معاملہ تھا۔ اس میں رواج کا ساتھ دینے کے بجائے اپنی قوت فیصلہ کو استعمال کرنا تھا۔ سامنے کے فائدے کو چھوڑ کر غیب کے فائدے کی جانب دوڑنا تھا۔ عافیت کی زندگی کو خیرباد کہہ کر کھکھیڑ کی زندگی اختیار کرنا تھا۔ ایک کے لئے دین ایک شان دار تجارت تھی دوسرے کے لئے دین سراپا قربانی۔ ایک گروہ حالات کے رتھ پر سوار تھا۔ دوسرے گروہ کا معاملہ یہ تھا کہ روایتی فکر کے دائرہ سے نکال کر اس نے اپنے آپ کو خدائے وحدہٗ لاشریک کا مومن بنایا تھا۔ دنیا کے بنے ہوئے نقشہ سے بغاوت کرکے اپنے آپ کو آخرت کے ان دیکھے راستہ پر ڈالا تھا۔ چلتی ہوئی زندگی سے موافقت کرنے کے بجائے ایک ایسی نئی تحریک کا ساتھ دیا تھا جس میں بظاہر کش مکش اور محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مزید یہ کہ اس قسم کی جان جوکھم دینداری اختیار کرنے کے بعد بھی وہ وقت کے مذہبی ٹھیکیداروں کی نظر میں بے دین ہی بنے ہوئے تھے۔

اللہ کے یہاں اُس ایمان کا درجہ بہت بڑا ہے جب کہ آدمی کا ایمان اس کے لئے عزتیں اور شوکتیں جمع کرنے کے ہم معنی نہ بن رہا ہو۔ جب ایمان کی راہ اختیار کرنا اس قیمت پر ہو کہ آدمی سے اس کا گھر بار اور عزیز و اقارب تک چھوٹ جائیں۔ جب اسلام کے لئے اٹھنے میں کچھ ملنا تو درکنار اپنے جان و مال کو اس کی راہ میں قربان کر دینا پڑے۔ ایسے ہی لوگ خدا کے سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے خدا کی رحمتیں اور اس کی رضامندیاں ہیں — ان کے لئے ابدی خوشیوں اور راحتوں کی وہ دنیا ہے جس کا دوسرا نام جنت ہے۔ موجودہ دنیا امتحان کا مقام ہے۔ یہاں حق کو ہمیشہ مشتبہ حالت (انعام ۹) میں سامنے لایا جاتا ہے۔ آدمی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ پردہ پوش حق کو بے پردہ حالت میں دیکھ لے۔ جو خدا کو اس کے غیبی لباس میں نہ پاسکے اس نے خدا کو پایا ہی نہیں۔ ■

یہ صفحہ آپ کے لئے خالی ہے۔ ہمارا ہر ہمدرد جو ہماری اپیل پر لبیک کہے وہ اس خالی صفحہ کو اپنے عہد کی سیاہی سے پُر کرے۔ یہاں وہ اپنے اس عزم کو تحریر کرے جو ملت کے اندر فکری بیداری پیدا کرنے کے لئے وہ اپنے رب کو گواہ بنا کر کرے گا ۔۔۔ کیا عجب کہ یہی ورق کسی وقت ملت کے مستقبل کا ورق بن جائے۔
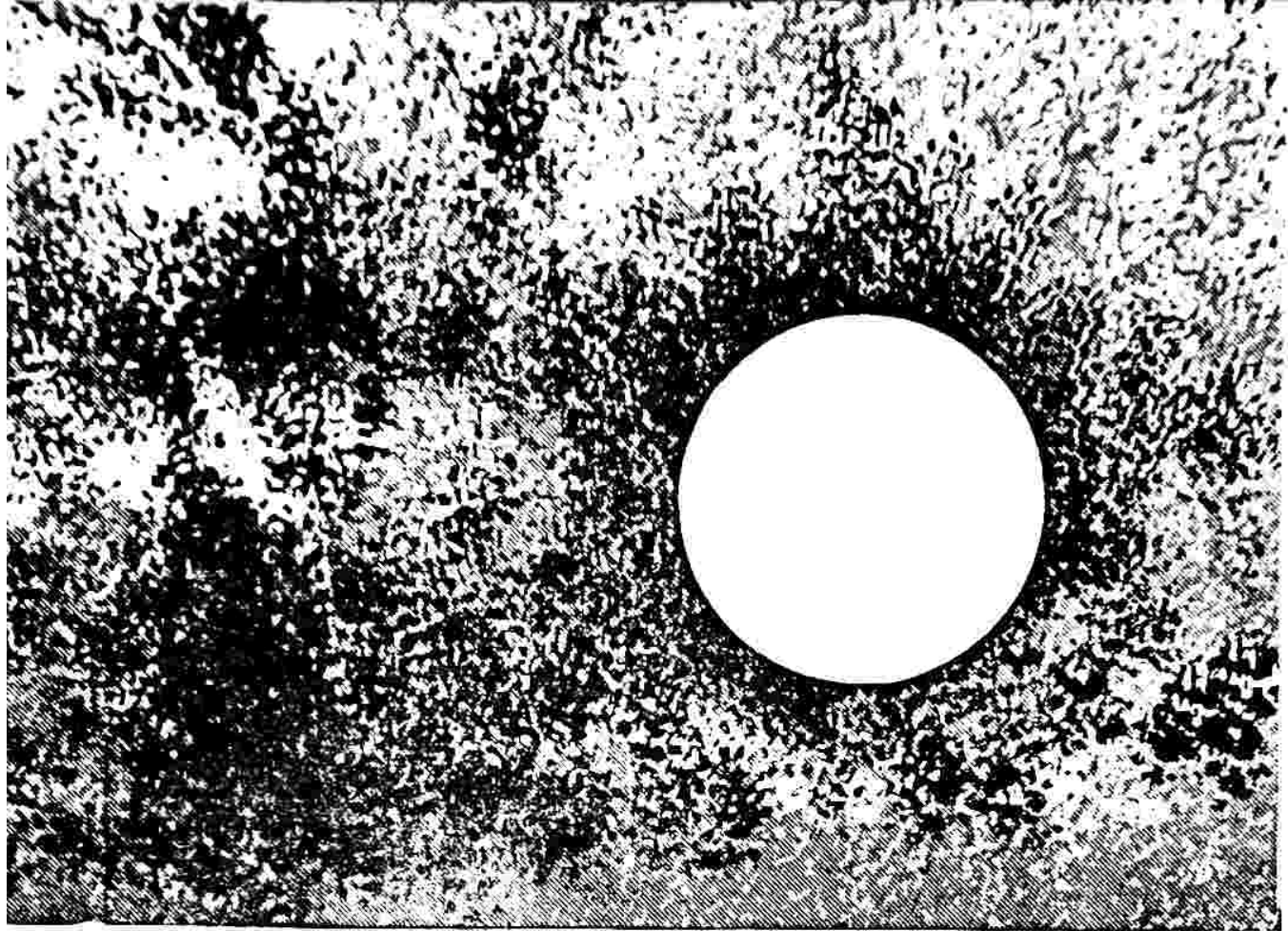
تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی مہم

آپ کو آواز دیتی ہے

وقتی جوش کے تحت بڑی قربانی دینا آسان ہے۔ مگر کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت تسلسل کے ساتھ دی جائیں۔ ہم اسی قسم کی ایک چھوٹی قربانی کے لئے آپ سے اپیل کر رہے ہیں۔

وہ لوگ جو الرسالہ کو ضروری اور مفید سمجھتے ہیں۔ ان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس کی ایجنسی قبول کر کے اس فکری مہم میں ہماری مدد فرمائیں۔

پانچ پرچہ کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپے ہوتی ہے۔ ہمارا ہر ہمدرد یہ طے کرے کہ وہ پانچ پرچے ہر حال میں منگائے گا۔ اور جب تک خریدار مہیا نہ ہوں لوگوں میں مفت تقسیم کرے گا۔ اور اس وقت تک ساڑھے سات روپے ماہانہ اپنے پاس سے ادا کرتا رہے گا جب تک خریدار نہیں مل جاتے۔

موجودہ حالات میں ایک شخص کے لئے یہ بہت چھوٹی قربانی ہے۔ لیکن اگر ہمارا ہر ہمدرد اس قربانی کو اپنی زندگی میں شامل کرے تو چند سالوں میں انشاء اللہ بہت بڑے نتائج نکل سکتے ہیں۔

یونیورسٹی کے ایک استاد نے اپنے ساتھی سے ماہنامہ الرسالہ کا تعارف کرتے ہوئے کہا:

IT PRESENTS ISLAM AS A LIVING FAITH

یہ اسلام کو ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

اس معاشرہ میں کوئی خوبی نہیں جس میں تنقید اور نصیحت کا ماحول نہ ہو

طبرانی نے عبدالعزیز بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کچھ لوگوں کو آپ سے شکایت ہوئی۔ انھوں نے ایک موقع پر آپ کو دھکا دے کر گرا دیا۔ آپ کے لڑکے دوڑے تو آپ نے فرمایا: ٹھیرو۔ خدا کی قسم کوئی جان جو نکالی جانے والی ہو، اس کا نکالا جانا مجھ کو ابوبکرہ کی جان نکالے جانے سے زیادہ محبوب نہیں۔ لڑکوں نے پوچھا کیوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ میں وہ زمانہ پاؤں جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کر سکوں، کیوں کہ اس وقت کوئی خیر نہ ہوگا (انی اخشی ان ادرک زمانا لا استطیع ان آمر بالمعروف ولا انہی عن منکر۔ ولا خیر یومئذ)

تنقید سن کر برہم نہ ہونا

عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ نے خالد بن الولید کو فوج کی سپہ سالاری سے معزول کر دیا۔ امام احمد نے ناشرہ بن سمی الیزنی سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے یوم جابیہ میں عمر رضی اللہ عنہ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا۔ آپ نے فرمایا: اے لوگو! میں تم کو بتاتا ہوں کہ میں نے خالد بن الولید کو کیوں معزول کیا۔ میں نے ان کو حکم دیا کہ اس مال کو کمزور مہاجرین کے لئے روکیں۔ مگر انھوں نے اس کو صاحب شرف اور صاحب لسان کو دے دیا۔ اس بنا پر میں نے ان کو معزول کر دیا۔ اور ان کی جگہ ابو عبیدۃ بن جراح کو مقرر کر دیا" ابو عمرو بن حفص (حضرت خالد کے رشتہ دار) مجمع میں موجود تھے۔ وہ اس کو سن کر اٹھے اور کہا: خدا کی قسم اے عمر بن خطاب! یہ کیا عذر ہے جو تم نے بیان کیا۔ تم نے اس شخص کو ہٹا دیا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا، تم نے وہ تلوار میان میں ڈال دی جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے نیام کیا تھا، تم نے وہ جھنڈا گرا دیا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑا کیا تھا (ووضعت لواء نصبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

تم نے اپنے چچا کے لڑکے سے حسد کا معاملہ کیا" عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو سنا اور اس کے بعد نرمی کے ساتھ فرمایا: تم خالد کے قریبی ہو، نو عمر ہو، اپنے چچازاد بھائی کے معاملہ میں غصہ میں آگئے ہو (انک قریب القرابۃ، حدیث السن، مغضب فی ابن عمک)

ان کا اختلاف حق کے لئے ہوتا تھا

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وظائف کی تقسیم میں مساوات برتتے تھے۔ آپ سے کہا گیا کہ مہاجرین وانصار کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیجئے۔ آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: ان کی فضیلت اللہ کے یہاں ہے۔ یہ گزر بسر کی چیز ہے، اس میں برابری بہتر ہے (فضائلهم عند الله واما هذا المعاش فالسوية فيه خير، احمد)

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس سے اختلاف تھا۔ آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے تقسیم وظائف میں درجات کے اعتبار سے فرق کیا۔ آپ نے مہاجرین وانصار کے لئے پانچ پانچ ہزار درہم مقرر کئے اور دوسرے مسلمانوں کے لئے چار چار ہزار درہم۔ اس اصول کے مطابق اسامہ بن زید کو چار ہزار درہم ملے۔ تاہم اپنے لڑکے عبداللہ رض کو صرف

تین ہزار درہم دیئے۔ انھوں نے کہا: "اسامہ بن زید کو آپ نے چار ہزار درہم دیئے اور میرے لئے تین ہزار درہم مقرر کئے۔ ان کو یا ان کے باپ کو کون سی فضیلت حاصل ہے جو مجھ کو نہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان کے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمھارے باپ سے زیادہ محبوب تھے اور وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے زیادہ محبوب تھے۔ (ان اباہ کان احب الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ابیک وھو کان احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منک، بزار) ایک روایت کے مطابق عمر رضی اللہ عنہ نے آخر عمر میں فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے عملاً زیادہ درست تھی (فرایہ خیر رائی، بزار)

وہ یاد دلاتے ہی واپس دوڑ پڑے

حنین کی جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ وہ میدان مقابلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ عباس رضی اللہ عنہ بلند آواز تھے۔ ان سے آپؐ نے کہا: اے چچا لوگوں کو پکاریئے۔ انھوں نے بلند آواز سے پکارنا شروع کیا: یا اصحاب السمرۃ (اے کیکر کے درخت کے نیچے موت کی بیعت کرنے والو، کہاں جا رہے ہو) حضرت عباس کہتے ہیں: خدا کی قسم جب انھوں نے میری آواز سنی تو انھوں نے کہا یا لبیکاہ، یا لبیکاہ۔ ہم آئے، ہم آئے۔ اور رسول اللہ کی طرف اس طرح دوڑ پڑے جیسے گائے اپنے بچھڑوں کی طرف دوڑتی ہے۔ (رواہ مسلم عن ابن وہب)

قرآن سامنے آتے ہی رک جانا

عبداللہ بن عباس رضی کہتے ہیں عُیینہ بن حصن مدینہ آئے اور اپنے بھتیجے حر بن قیس کے یہاں ٹھہرے۔ حر بن قیس ان لوگوں میں تھے جن کو عمر رضی اللہ عنہ کی قربت حاصل تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس اور ان کے مشوروں میں شریک ہونے والے قرآن کے علماء ہوتے تھے خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان۔ عیینہ نے حر بن قیس سے کہا: اے میرے بھتیجے! تم کو امیر المومنین کے یہاں رتبہ حاصل ہے، میرے لئے امیر المومنین سے ملنے کی اجازت حاصل کرو۔ انھوں نے اجازت مانگی اور عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ عیینہ آئے اور کہا: اے خطاب کے لڑکے! تم ہم کو نہ مال دیتے ہو اور نہ ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے ہو (ھی یا ابن الخطاب! فواللہ ما تعطینا الجزل ولا تحکم فینا بالعدل) عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر غصہ میں آگئے۔ قریب تھا کہ ان پر ٹوٹ پڑیں۔ اتنے میں حر بن قیس نے کہا: اے امیر المومنین! اللہ نے اپنے رسول سے کہا ہے "معافی کا طریقہ اختیار کرو، نیکی کا حکم کرو اور جاہلوں سے اعراض کرو (اعراف ۱۹۹) اور یہ شخص یقیناً جاہل ہے۔ راوی کہتے ہیں: واللہ ما جاوزھا عمر حین تلاھا وکان وقافا عند کتاب اللہ (بخاری) خدا کی قسم۔ قرآن کی آیت سننے کے بعد عمر رضی نے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا۔ وہ قرآن کے سامنے بہت زیادہ رک جانے والے تھے۔

ضد اور عناد ان کے لئے سچائی کو پہچاننے میں رکاوٹ نہ بن سکا

ہجرت سے چند سال پہلے مدینہ میں اسلامی دعوت کا آغاز ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیر رضی کو مدینہ بھیجا۔ وہ وہاں پہنچ کر خاموشی سے لوگوں کے درمیان اسلام کی تبلیغ کرتے اور قرآن پڑھ کر سناتے۔ سعد بن معاذ

مدینہ کے قبیلہ بنوعبدالاشہل کے سردار تھے۔ ان کو معلوم ہوا تو بہت خفا ہوئے۔ ایک روز نیزہ لے کر مصعب بن عمیر کی تلاش میں نکلے۔ بستی کے باہر ایک کنوئیں پر ان کو پایا جو کچھ لوگوں کو جمع کرکے ان کو دینی باتیں بتا رہے تھے۔ سعد بن معاذ قریب آئے اور غصہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: کون اس اجنبی شخص کو یہاں لایا ہے جو ہمارے کمزور لوگوں کو بہکاتا ہے کیا تم ہمارے گھروں میں وہ چیز داخل کرنا چاہتے ہو جس کو ہم برا سمجھتے ہیں۔ بس آج کے بعد میں تم کو یہاں نہ دیکھوں" اسعد بن زرارہ جو ان کے ہم قبیلہ تھے اور اسلام لاچکے تھے بولے: "میرے خالہ زاد بھائی! ان کی بات بھی سن لو۔ اگر نامعقول ہو تو رد کر دینا اور معقول دکھائی دے تو مان لینا" سعد بن معاذ کچھ نرم پڑے۔ انھوں نے کہا ان کی بات کیا ہے۔ مصعب بن عمیر نے اس کے جواب میں قرآن سے سورہ زخرف کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا۔ قرآن کو سنتے ہی ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ نئی سوچ میں پڑ گئے۔ یہاں تک کہ چند روز بعد انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اب انھوں نے خود ہی بنوعبدالاشہل میں تبلیغ شروع کردی۔ انھوں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا:

من شك من صغير او كبير او ذكر او انثى فليأتنا باهدى منه نلخذ به فوالله لقد جاء امر لتحزن فيه الرقاب (ابونعیم فی دلائل النبوۃ)

کسی چھوٹے یا بڑے، مرد یا عورت کو اس کے بارے میں شک ہو تو وہ ہمارے پاس اس سے زیادہ ہدایت والی چیز لائے ہم اس کو لے لیں گے۔ خدا کی قسم یہ ایک ایسی بات آگئی ہے کہ اس کے آگے گردنیں جھک جائیں۔

اپنے خلاف تنقید کو پسند کرنا

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ اس شخص کا بھلا کرے جو میرے عیوب کا تحفہ مجھے بھیجے۔

انصاف میں بڑے چھوٹے کا لحاظ نہیں

امام شعبی نے روایت کیا ہے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ایک زرہ جنگ جمل میں کھو گئی تھی۔ حضرت علی ایک روز بازار میں چل رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک نصرانی زرہیں بیچ رہا ہے۔ انھوں نے اپنی گم شدہ زرہ اس کے پاس پہچان لی اور کہا کہ یہ میری زرہ ہے۔ مسلمان قاضی میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ حضرت علی امیرالمومنین تھے اور قاضی شریح اس وقت قضا کے عہدہ پر تھے۔ مقدمہ قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہوا۔ حضرت علی نے کہا: "اے شریح! میرے اور اس کے درمیان فیصلہ کرو" قاضی شریح نے کہا "اے امیرالمومنین۔ آپ کا دعویٰ کیا ہے"۔ حضرت علی نے کہا "یہ زرہ میری ہے"۔ قاضی شریح نے نصرانی سے کہا: "تم کیا کہتے ہو"۔ نصرانی نے کہا: "امیرالمومنین غلط بیانی کر رہے ہیں یہ زرہ میری ہے"۔ قاضی شریح نے حضرت علی سے کہا: آپ کے گواہ کون ہیں۔ حضرت علی نے اپنے لڑکے حسن اور اپنے غلام قنبر کو پیش کیا۔ قاضی شریح نے کہا: حسن کی جگہ کوئی اور گواہ لائیے۔ حضرت علی نے کہا: اترد شهادة الحسن (کیا تم حسن کی شہادت کو رد کر رہے ہو) قاضی شریح نے جواب دیا: یہ بات نہیں۔ مگر میں نے آپ ہی سے سن کر یاد کیا ہے کہ لڑکے کی گواہی باپ کی موافقت میں جائز نہیں۔ (لا، ولكن حفظت عنك انه لا تجوز شهادة الولد على والده، (کنز العمال، جلد ۴، صفحہ ۶)

مجلس میں گفتگو کے آداب

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے بارے میں فرماتے ہیں۔ آپ جب گفتگو کرتے تو مجلس میں بیٹھنے والے اس طرح سر جھکا لیتے گویا ان کے سروں کے اوپر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ جب آپ اپنی بات کہہ کر چپ ہو جاتے تب دوسرے لوگ بولتے۔ آپ کے پاس لوگ کسی بات پر نزاع نہ کرتے۔ ایک شخص بولتا تو دوسرے لوگ چپ ہو کر سنتے یہاں تک کہ بولنے والا اپنی بات کو پورا کرلے۔ آپ کی مجلس میں ہر شخص کی بات یکساں توجہ سے سنی جاتی (لا یتنازعون عندہ الحدیث۔ ومن تکلم عندہ انصتوا لہ حتی یفرغ۔ حدیثہم عندہ حدیث اولہم، الشمائل للترمذی)

جواب میں الزام تراشی نہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب ابتدائی زمانہ میں آپ کے سرپرست تھے۔ بعثت کے دسویں سال ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو مکہ والوں کو موقع مل گیا۔ انھوں نے آپ کو برادری سے خارج کر دیا۔ اب ضروری تھا کہ آپ اپنے لیے کوئی نیا حمایتی تلاش کریں۔ آپ اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کو لے کر عکاظ کے میلہ میں گئے۔ وہاں مختلف قبائل کے خیموں میں جا کر ان سے کہا کہ مجھے اپنی حمایت میں لے لو تاکہ میں اپنے تبلیغی کام کو جاری رکھ سکوں۔ مگر قریش مکہ کے ڈر سے کوئی تیار نہ ہوا۔ اگلے سال دوبارہ آپ عرب کے میلوں میں حمایتی کی تلاش میں نکلے۔ بالآخر یثرب (مدینہ) کے قبائل اوس و خزرج کے چھ آدمیوں سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ آپ نے ان کو اسلام کا پیغام دیا۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ پر جو وحی آتی ہے وہ کیا ہے۔ آپ نے ان کو سورہ ابراہیم کی آیتیں سنائیں۔ اس کو سن کر ان کا دل نرم ہو گیا۔ انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ آپ ان لوگوں سے باتیں کر رہے تھے کہ عباس بن عبد المطلب ادھر سے گزرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پہچان کر وہ وہاں آگئے۔ انھوں نے پوچھا: "اے میرے بھتیجے یہ کون لوگ تمھارے پاس ہیں" آپ نے جواب دیا: اے میرے چچا یہ یثرب کے رہنے والے ہیں۔ میں نے ان کو وہ دعوت پیش کی جو اس سے پہلے دوسرے قبائل کے سامنے پیش کی تھی، انھوں نے مان لیا اور میری تصدیق کی۔ وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ مجھ کو اپنے یہاں لے جائیں۔ عباس بن عبد المطلب سواری سے اتر پڑے۔ انھوں نے اپنے اونٹ کو باندھ دیا اور کہا: اے اوس اور خزرج کی جماعت! یہ میرا بھتیجا ہے اور وہ مجھ کو تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہے۔ اگر تم نے اس کی تصدیق کی ہے اور اس پر ایمان لائے ہو اور اس کو اپنے یہاں لے جانا چاہتے ہو تو میں تم لوگوں سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں تاکہ میرا دل مطمئن رہے۔ وہ یہ کہ تم اس کو رسوا نہیں کرو گے اور اس کو دھوکا نہیں دو گے۔ کیوں کہ تمھارے پڑوس میں یہود ہیں اور یہود اس کے دشمن ہیں۔ اور میں اپنے بھتیجے کو ان کے مکر سے محفوظ نہیں سمجھتا۔ اسعد بن زرارہ، جو یثرب والوں کے سردار تھے، ان کو عباس بن عبد المطلب کا یہ قول برا معلوم ہوا۔ کیوں کہ انھوں نے ان کے کردار پر شک و شبہ کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے عباس بن عبد المطلب کا جواب دینے کی اجازت دیجیے۔ آپ نے فرمایا: تم جواب دو، مگر جواب میں الزام کا طریقہ نہ اختیار کرنا (اجیبوہ غیر متہمین، ابونعیم، دلائل النبوۃ ص۱۰۵)

بے فائدہ باتوں کا جواب نہ دینا

ابوسفیانؓ کی بیوی ہند بنت عتبہ فتح مکہ کے بعد اسلام پر بیعت ہونے کے لئے آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کے الفاظ ادا کرتے ہوئے فرمایا ولا تقتلن اولادکن (تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگی)۔ ہند نے کہا: انت قتلتھم یوم بدر (ان کو تو آپ ہی نے جنگ بدر میں قتل کردیا)۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: وھل ترکت لنا اولادا نقتلھم (کیا آپ نے ہماری اولاد کو باقی رکھا ہے جو ہم انھیں قتل کریں، تفسیر ابن کثیر جلد ۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور ہند بنت عتبہ کی بیعت قبول کرلی۔

طعن و طنز کی زبان میں کلام کرنا درست نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تے تبوک پہنچ کر جب دیکھا کہ لشکر میں کعب بن مالک رضؓ نہیں ہیں تو آپ نے فرمایا: ما فعل کعب (کعب نے کیا کیا) بنی سلمہ کے ایک شخص نے کہا: اے خدا کے رسول، ان کو ان کی چادر نے اور اپنے کاندھوں کو دیکھنے نے روک دیا (حبسہ بُرداہ ونظرہ فی عطفیہ) معاذ بن جبل نے جواب دیا: تم نے نہایت بری بات کہی۔ اے خدا کے رسول! ہم نے کعب میں خیر کے سوا کوئی اور بات نہیں دیکھی (بئس ما قلت، واللہ یا رسول اللہ ما علمنا علیہ الا خیرا، البدایہ والنہایہ)

زبان کو روکنا تمام بھلائیوں کا دروازہ

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ انھوں نے آپ سے پوچھا: اے خدا کے رسول مجھے ایسا عمل بتائیے جو مجھ کو جنت میں لے جائے اور جہنم سے دور کردے۔ آپ نے فرمایا تم نے بہت بڑی بات پوچھی۔ اور یہ آسان ہے جس پر اللہ اس کو آسان کردے۔ پھر آپ نے فرمایا: تم اللہ کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیراؤ، نماز ادا کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔ پھر فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں کہ بھلائی کے دروازے کیا ہیں۔ سنو، روزہ ڈھال ہے، صدقہ گناہ کو اس طرح بجھاتا ہے جس طرح پانی آگ کو۔ اور رات کی خاموشی میں اٹھ کر نماز پڑھنا۔ پھر فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں کہ دین کا سرا کیا ہے اور اس کا ستون کیا ہے اور اس کی چوٹی کیا ہے۔ میں نے کہا ضرور اے خدا کے رسول۔ فرمایا: اس کا سرا اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے، اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔ پھر فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں کہ ان تمام چیزوں کی جڑ کیا ہے۔ میں نے کہا ضرور اے خدا کے رسول۔ آپ نے اپنی زبان پکڑلی اور فرمایا کُفَّ علیک ھٰذا (اس کو روکے رکھو) میں نے کہا اے خدا کے رسول ہم جو کچھ بولتے ہیں، کیا اس کا بھی ہم سے مواخذہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا: تمھاری ماں تمھیں گم کرے۔ لوگ اپنی زبان کی بدولت ہی تو آگ میں منھ کے بل گرائے جائیں گے (ثکلتک امک وھل یکبّ الناس فی النار علی وجوھھم الا حصائد السنتھم، ترمذی)

کھانے کو برا نہ کہنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کوئی کھانا پیش کیا جاتا تو کبھی اس کو برا نہ کہتے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

لکھتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے کو عیب نہیں لگایا۔ اگر رغبت ہوتی تو کھالیتے، ناپسند ہوتا تو چھوڑ دیتے (ماعاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طعاما قط۔ ان اشتھاہ اکلہ وان کرھہ ترکہ۔ بخاری و مسلم)

مشتعل ہوئے بغیر معترض کو جواب دینا

علقمہ کہتے ہیں۔ بنو اسد کی ایک عورت جس کا نام ام یعقوب تھا، عبد اللہ بن مسعود رض کے پاس آئی اور کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ گودنا گودنے والے اور گودنا گدانے والے پر لعنت کرتے ہیں۔ حالاں کہ میں نے قرآن کو شروع سے آخر تک پڑھا ہے اور اس میں میں نے وہ بات نہیں پائی جو آپ کہتے ہیں۔" پھر اس نے کہا: اور میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ کے گھر والے بھی ضرور ایسا کرتے ہوں گے (انی لاظن اھلک یفعلون بعض ذلک) عبد اللہ بن مسعود رض نے کہا تم میرے گھر میں جاکر دیکھ لو۔ وہ گھر کے اندر گئی اور دیکھا۔ مگر کسی پر گودنے کا نشان نہ پایا۔ وہ واپس آئی تو عبد اللہ بن مسعود رض نے اس سے کہا: کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا کہ "رسول جو دے اس کو لے لو اور جس سے وہ روکے اس سے رک جاؤ"۔ عورت نے کہا ہاں۔ انھوں نے کہا: فانہ قد نھی عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے) جامع بیان العلم وفضلہ دوم ۱۸۸

کسی کو حقیر الفاظ میں یاد نہ کیا جائے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اہلیہ عائشہ رض کے حجرہ میں تھے۔ گفتگو کے دوران عائشہ رض کی زبان سے اپنی سوکن صفیہ رض کے بارے میں نکل گیا: "حسبک من صفیۃ کذا وکذا" وہ حضرت صفیہ رض کے ناٹے قد کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ یہ سنتے ہی اچانک آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے ایسی بات کہی کہ اگر اس کو سمندر میں ملایا جائے تو سمندر کا پانی بھی بدل جائے (لقد قلتِ کلمۃ "لو مُزِجت بماء البحر لمزجتہ"، ابو داؤد، ترمذی)

خاموش رہنا اور اہل تر کو بولنے کا موقع دینا

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو مدینہ میں نفاق نے زور پکڑا اور عرب و عجم مرتد ہونے لگے۔ نہاوند (ایران) سے ان کی سازباز ہوگئی۔ انھوں نے کہا وہ آدمی (رسول) وفات پاگیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو خدا کی مدد حاصل ہوتی تھی۔ اس وقت خلیفہ اول ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور کہا: ان عربوں نے بکری اور اونٹ (زکوٰۃ) دینا بند کر دیا ہے۔ وہ اسلام سے پھر گئے ہیں۔ عجمیوں نے نہاوند والوں سے سازباز کرلی ہے تاکہ وہ مل کر تم سے لڑیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ شخص چلا گیا جس کی وجہ سے تمھاری مدد ہوتی تھی۔ اب تم لوگ مجھ کو مشورہ دو۔ میں بھی تمھاری طرح ایک آدمی ہوں۔ بلکہ خلافت کا بوجھ اٹھانے کے لئے تم سب سے زیادہ کمزور رہوں۔" عبد اللہ بن عمر رض کہتے ہیں: صحابہ کرام نے سنا اس کے بعد وہ چپ ہو کر بہت دیر تک گردن جھکائے رہے پھر عمر بن الخطاب رض بولے۔۔۔ (فاطرقوا طویلا۔ ثم تکلم عمر بن الخطاب رض فقال۔۔ کنز

بولنے میں احتیاط

اشعث بن شعبہ کہتے ہیں کہ انھوں نے فزاری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عمر بن عبد العزیز سے پوچھا گیا کہ جنگ صفین میں جو لوگ لڑے اور مارے گئے۔ ان کی بابت آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا: یہ وہ خون ہے جس سے اللہ نے میرے ہاتھ کو محفوظ رکھا۔ میں نہیں چاہتا کہ میں اپنی زبان کو اس سے آلودہ کروں (تلك دماء كف الله عنها يدي لا اريد ان الطخ بها لساني، ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، جزء ثاني، صفحہ ۹۳)

تنقید مگر بحث و جدال نہیں

بیان کیا گیا ہے کہ طاؤس اور وہب ابن منبہ دونوں ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا۔ اے ابو عبد اللہ میں نے آپ کے بارے میں ایک سنگین بات سنی ہے۔ انھوں نے پوچھا کیا بات۔ طاؤس نے کہا۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ اللہ ہی تو تھا جس نے قوم لوط کو ایک دوسرے پر سوار کیا۔ وہب نے یہ سن کر کہا۔ اللہ کی پناہ۔ پھر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔ کیا دونوں میں کوئی بحث ہوئی۔ راوی نے کہا نہیں۔ (روینا ان طاؤسا و وهب ابن منبه التقيا فقال طاؤس لوهب يا ابا عبد الله بلغني عنك امر عظيم۔ فقال ماهو۔ قال تقول ان الله حمل قوم لوط بعضهم على بعض۔ قال اعوذ بالله۔ ثم سكتا۔ قال فقلت هل اختصما، قال لا۔ ابن عبد البر جامع بيان العلم وفضله، جزء ثاني، صفحہ ۹۵)

تنقید غلطی کی نشان دہی کا نام ہے نہ کہ عیب لگانے کا

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں جو باہمی لڑائیاں ہوئیں، ان سے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بالکل الگ رہے تھے۔ اپنی علیحدگی کے بارے میں انھوں نے بار بار کہا کہ "میں مسلمان کے ہاتھ سے مسلمان کا خون کرنا جائز نہیں سمجھتا، اس لئے اس سے الگ ہوں"۔ تمام امت آپ کے اخلاص اور تقویٰ اور اصابت رائے پر متفق ہے۔ مگر آپ کے معاصرین نے آپ کو متہم کرنے کے لئے ایک پہلو نکال لیا۔ کچھ لوگ آپ سے ملے اور کہا کہ آپ کیوں "جہاد" کے لئے نہیں نکلتے۔ عبد اللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں کی اس لڑائی کو جہاد نہیں سمجھتا۔ یہ مسلمانوں کا باہمی قتل و خون ہے نہ کہ جہاد۔ مگر لوگ ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا:

والله ما رأيك ذلك ولكنك اردت ان يفني اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بعضهم بعضا حتى اذا لم يبق غيرك قيل: بايعوا لعبد الله بن عمر بامارة المؤمنين۔ (ابو نعيم، حلية الاولياء، جلد ۱ صفحہ ۲۹۴)

خدا کی قسم تمہاری یہ رائے کچھ نہیں۔ بلکہ تم چاہتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کو فنا کر دیں۔ یہاں تک کہ جب تمہارے سوا کوئی باقی نہ رہے تو کہا جائے: مسلمانوں کی امارت کے لئے عبد اللہ بن عمرؓ سے بیعت کرو۔

اختلاف رائے کو برداشت کرنا علم کی نشانی ہے

قال سعيد بن ابي عروبة من لم يسمع الاختلاف فلا تعده عالما — جو شخص اختلاف کو نہ سنے اس کو عالم نہ شمار کرو (جامع ۴۶)

امریکہ نئے انقلاب کے دروازہ پر

"بیسویں صدی کا انقلاب امریکہ میں آئے گا۔ دوسرے ملکوں میں انقلاب آتا ہے یا نہیں، اس کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اولاً امریکہ میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔" (جین فرانکوئس ریول)

اس بات کو میں ایک ترمیم کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں۔ امریکہ موجودہ زمانہ میں کسی صحیح انقلاب کے لئے سب سے بہتر زمین ہے، کیونکہ اپنے سائنسی مزاج کی بنا پر وہ اپنے اندر سب سے زیادہ مادۂ قبولیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف وسائل و ذرائع کے اعتبار سے تمام ملکوں میں سب سے آگے ہے، بلکہ وہی سب سے زیادہ ترقی یافتہ سائنسی معاشرہ بھی ہے۔ اس لئے یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ موجودہ زمانہ میں بڑے پیمانہ پر اسلامی دعوت پھیلانے کے لئے سب سے موزوں جگہ غالباً ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہے۔ ☰

ایک سو کمروں کا مذہبی مرکز انگلستان میں

Mahesh Yogi buys mansion in England

LONDON, November 22 (UNI): Maharishi Mahesh Yogi has bought a 100-room mansion in England to serve as an international centre for his "transcendental meditation" movement, DPA reports.

The mansion, Mentmore Towers, was built between 1851 and 1854 for a leading member of the Rothschild banking family.

The contents of the house were sold last year for a then record art auction total in England of some £8 million. The British government had refused to pay £22 million for the house and its contents by the owner, the Earl of Rosebery. The earl had also wanted exemption from death duties.

Critics blamed the government for failure to preserve British architectural heritage in not accepting the Rosebery offer.

T.O.I. 23-11-1978

مہارشی مہیش یوگی، دوسرے بہت سے ہندو یوگیوں کی طرح، مغربی دنیا میں اپنے دھرم کا پرچار کر رہے ہیں۔ انگریزی زبان پر ان کو مکمل قدرت ہے اور بہت موثر انداز میں اپنی بات کو سمجھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امریکہ میں ان کے لاکھوں معتقدین ہیں۔ ان کے نام پر "مہارشی مہیش یونیورسٹی" قائم ہے۔ اور دوسرے بہت سے کام ہو رہے ہیں۔ اب انھوں نے انگلستان میں اپنے مشن کا ایک مرکز قائم کرنے کے لئے ایک عمارت خریدی ہے جس میں ایک سو کمرے ہیں ——— موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں مذہب کو نئی زندگی مل رہی ہے۔ ہر مذہب کے لوگ دنیا بھر میں اپنے لئے کام کے زبردست مواقع پا رہے ہیں۔ مذہب کے اس جدید احیاء نے مذہب کو موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا کاروبار بنا دیا ہے۔ ☰

صنعتی تہذیب کا رد عمل ——— بے راہ روی

امریکہ کے نوجوان طالب علموں میں ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنے کو مخالف رواج (Anti-Establishment) کہتا ہے۔ گندے کپڑے اور الجھے ہوئے بال ان کا نشان ہیں۔ وہ گندے قسم کے گانے گاتے ہیں۔ ان کے حالات کو قریب سے جاننے کے لئے امریکہ کے ایک شخص نے اسی قسم کا روپ اختیار کر لیا۔ اس کا نام ایلوس پرسلی (Elvis Presley) تھا۔ ان کے درمیان کچھ عرصہ رہنے کے بعد اس کو اندازہ ہوا کہ ان کے عادات و اطوار امریکی معاشرہ کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں۔ اس نے حکومت کے محکمہ سراغ رسانی (FBI) کے ڈائرکٹر ایڈگر ہوور (J.Edger Hoover) سے ملنا چاہا۔ مگر اس کے ظاہری حلیہ کی وجہ سے ڈائرکٹر نے اس سے ملنا پسند نہ کیا۔ یہاں تک کہ اگست ۱۹۷۷ میں مسٹر پرسلی کا انتقال ہو گیا۔ ☰

قولِ اسلام کا معیار اتحادِ اسلام ہے

یا ایہا الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون۔ اے ایمان والو کیوں کہتے ہو منھ سے جو نہیں کرتے۔
کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون۔ بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو۔
ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً اللہ چاہتا ہے ان کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار
کانہم بنیان مرصوص (الصف) باندھ کر جیسے وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔

اس آیت کے مطابق قولِ اسلام کی صداقت کی جانچ اتحادِ اسلام ہے۔ اسلام کے قائلین اگر اسلامی مہم کے لئے متحد نہ ہو سکیں تو ان کا قول اللہ کی نظر میں مقت کبیر کی حیثیت رکھتا ہے جس کی کوئی قیمت نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں۔

یہ اصول نہایت اہم نکتہ پر مبنی ہے۔ کوئی بڑا کام اتحاد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ مگر اتحاد ایک بہت بڑی قربانی مانگتا ہے۔ یہ آدمی کے "انا" کی قربانی ہے۔ جب زیادہ انسان ایک محاذ پر جمع ہوں گے تو لازمی ہے کہ ان میں رایوں کا اختلاف ہو۔ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ بار بار نفس کو ٹھیس لگے۔ ہر آدمی بڑا بننا چاہتا ہے۔ ہر آدمی اپنے اندر یہ سویا ہوا جذبہ رکھتا ہے کہ "میری چلے، دوسرے کی نہ چلے"۔ ایسی حالت میں جب بھی کچھ لوگ جمع ہوں گے تو لازماً آپس میں ٹکراؤ ہوگا۔ کہیں خلاف مزاج بات کو برداشت کرنا ہوگا۔ کہیں تنقید سننی پڑے گی۔ کہیں اپنی شکست پر صبر کرنا ہوگا۔ کہیں اپنی بے عزتی کو سہنا ہوگا۔ کہیں اپنے مقابلہ میں دوسرے کو ترجیح دینی ہوگی۔ کہیں اجتماعی مصلحت کی خاطر اپنی ذاتی رائے کو قربان کرنا ہوگا۔ کہیں ایک جائز کریڈٹ سے محرومی پر اپنے کو راضی کرنا پڑے گا۔ غرض بے شمار قسم کی ناخوش گواریاں سامنے آئیں گی۔ ایسی حالت میں اتحادِ عمل پر وہی قائم رہ سکتا ہے جو اپنی "انا" کو ختم کر کے مسلمان بنا ہو۔ جو اپنی ذات کو دفن کر کے اجتماعیت میں شامل ہوا ہو۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ کی کبریائی پر ایمان لانے کے باوجود اپنی انا کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہو وہ کبھی متحدہ جدوجہد پر ٹھیر نہیں سکتا۔

اللہ پر ایمان، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اپنی ذات کی نفی کا نام ہے۔ اور اتحاد میں سب سے زیادہ اسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ متحدہ جدوجہد سب سے بڑی اور یقینی کسوٹی ہے جس پر جانچ کر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ آدمی اپنی ذات کی نفی کر کے اسلام میں داخل ہوا ہے یا اپنی انا کے بت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ جو لوگ اپنی انا کے بت کو توڑ چکے ہوں ان کے لئے کوئی چیز اتحادِ عمل میں مانع نہیں ہوتی۔ اسی لئے اسلام کے محاذ پر جب ایسے لوگ قابلِ لحاظ تعداد میں جمع ہو جائیں تو لازماً وہ کامیاب ہو کر رہتے ہیں۔ آخرت کی جنت بھی ان کے لئے لکھ دی جاتی ہے اور دنیا کا غلبہ بھی (صف ۱۳) مگر جو لوگ اپنی انا کے بت کو لئے ہوئے ہوں، وہ کبھی متحدہ طاقت نہیں بنتے۔ اور اس طرح وہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کا "قول" حقیقۃً قول بلا فعل تھا۔ ایسے لوگ اللہ کی نظر میں بالکل بے قیمت ہیں۔ خواہ اپنی خوش فہمیوں کی دنیا میں وہ کتنا ہی زیادہ بڑے نظر آتے ہوں۔ ایمان باعمل کی کسوٹی جو خدا نے مقرر کی ہے وہ اسلام کے لئے متحدہ عمل ہے۔ کوئی دوسری کسوٹی خواہ بظاہر کتنی ہی بڑی دکھائی دے خدا کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

■■ خدا کی طرف

مارکونی پہلا شخص تھا جس نے ۱۹۰۱ء میں بحر اٹلانٹک کے ایک طرف سے دوسری طرف ریڈیو لہریں بھیجنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس وقت یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ کون سا ذریعہ ہے جس نے لہروں کے اس سفر میں مدد دی ہے۔ ۱۹۲۴ میں ایڈورڈ ایپلٹن وغیرہ نے دریافت کیا کہ یہ زمین کی اوپری فضا میں آئنو اسفیر کی موجودگی ہے جو لاسلکی پیغام رسانی کو ممکن بناتی ہے۔

تاہم یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ فضا میں آئنو اسفیر کا یہ حیرت انگیز نظام کس نے قائم کر رکھا ہے —— اس قسم کے سوالات کا سائنس کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ساری ترقیات کے باوجود علم کی یہ بے بسی انسان کو خدا کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس سلسلے کا تازہ واقعہ یہ ہے کہ چاند پر جانے والے امریکی خلاباز آرم اسٹرانگ نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ علم کی ترقی نے انسان کے اس احساس میں صرف اضافہ کیا ہے کہ خدا کے آگے جھکنے کے سوا اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

■■ کام کا صحیح طریقہ

شری نانک جی موٹوانی (۱۹۷۰ - ۱۹۰۲) ایک آزادی پسند ہندوستانی تھے۔ ۱۹۴۲ میں ان کو نظر بند کیا گیا کی سزا ہوئی۔ وہ آٹھ مہینے جیل میں رہے۔ مہاتما گاندھی، سردار پٹیل، پنڈت نہرو، راجندر پرشاد وغیرہ سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔

یہی نانک جی موٹوانی ہیں جنھوں نے ہندستان میں سب سے پہلے لاؤڈ اسپیکر کی صنعت قائم کی۔ انھوں نے دیکھا کہ ہندستانی لیڈروں کے جلسہ میں بہت بڑا بڑا مجمع اکٹھا ہوتا ہے۔ مگر لاؤڈ اسپیکر نہ ہونے کی وجہ سے مقرر کی آواز پوری طرح لوگوں تک نہیں پہنچتی۔ انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی فیصلہ کا نتیجہ مشہور لاؤڈ اسپیکر شکاگو ریڈیو (Chicago Radio) تھا۔ جس سے آج سارا ہندستان واقف ہے۔

صرف اخبار نکالنا اور جلسہ کرنا کام نہیں۔ کام یہ ہے کہ مختلف لوگ مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگیں۔ اس کے بغیر حقیقی ترقی نہیں ہو سکتی۔

■■ کون کس کی جیب میں

پہلی جنگ عظیم کے بعد جس زمانہ میں خلافت تحریک کا زور تھا، علی برادران نے ملک کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ جو ان دنوں ترک موالات کی تحریک چلا رہے تھے۔ مولانا شوکت علی ان دنوں اکثر فخریہ انداز میں کہتے تھے "گاندھی جی میری جیب میں ہیں"۔ کچھ دنوں بعد سیاسی اختلافات ہوئے اور علی برادران نے مہاتما گاندھی کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنا راستہ الگ اختیار کیا۔ مولانا محمد علی لندن میں انتقال کر گئے۔ اور مولانا شوکت علی محمد علی جناح کے ساتھ مل گئے۔

ایک بار مسلم لیگ کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا شوکت علی نے کہا: "مہاتما گاندھی کہاں ہیں جنھوں نے گول میز کانفرنس میں اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو سادہ چک دینے کے لئے تیار ہیں"۔ مہاتما گاندھی کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنی پرارتھنا کی تقریر میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا: "بڑے بھائی کو اپنی جیب دیکھنا چاہئے۔ وہ مجھ کو وہاں پائیں گے"۔ (ریڈینس ۲۶ نومبر ۱۹۷۸)

زیادہ بڑی ذلت

کرشن چند آئی سی ایس (۱۹۷۸ - ۱۹۱۷) ایمرجنسی کے زمانہ میں دہلی کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ جنتا حکومت آنے کے بعد شاہ کمیشن قائم ہوا تو اس نے کرشن چند کو ایمرجنسی کے زمانہ میں دہلی میں ہونے والے واقعات کا براہ راست ذمہ دار قرار دیا۔ وہ اس سے اتنا پریشان ہوئے کہ ۱۰ جولائی ۱۹۷۸ کو جنوبی دہلی کے ایک کوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔ اپنے پیچھے انھوں نے ایک تحریر چھوڑی جس میں ہندی میں لکھا ہوا تھا:

جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

آدمی "مرنے" کو "مٹنے" کے ہم معنی سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ دنیا کی ذلت سے گھبرا کر خودکشی کرلیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مرکر میں ذلت سے نجات پا جاؤں گا۔ اگر اس کو معلوم ہو کہ مرنے کے بعد شدید تر ذلت پیش آسکتی ہے تو وہ زندگی کو "ختم" کرنے کے بجائے زندگی کو صحیح بنانے کی کوشش کرے تاکہ اگلی دنیا میں مستقل ذلت اور تکلیف سے بچ سکے۔

تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ قریب کے گاؤں کے کچھ لوگوں نے آخر وقت میں کنوئیں کے اندر سے "بچاؤ بچاؤ" کے الفاظ سنے تھے۔ موت کو دیکھنے سے پہلے کرشن چند موت کو دنیا کی زندگی سے اچھا سمجھتے تھے۔ مگر جب وہ موت سے دوچار ہوئے تو معلوم ہوا کہ موت دنیا کی زندگی سے بھی زیادہ بھیانک ہے ——— یہ صرف "موت" کا معاملہ ہے۔ آدمی اگر موت کے اس پار کا عالم دیکھ لے جہاں ہر غافل اور سرکش انسان کے لئے آگ کا الاؤ بھڑک رہا ہے تو اس کی زندگی میں انقلاب آجائے۔ وہ موجودہ زندگی کو ہمہ تن اگلی زندگی کی بہتری میں لگا دے۔

●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●

یہ بے اعتمادی کی فضا

یہ اعظم گڑھ ریلوے اسٹیشن کا واقعہ ہے۔ میں بکنگ کی کھڑکی پر اپنا ٹکٹ لے رہا تھا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آیا اس کو کسی مقام کا ٹکٹ لینا تھا جس کی قیمت پانچ چھ روپے ہوتی تھی۔ اس نے ریزگاری بکنگ کلرک کے سامنے پیش کرتے ہوئے اپنا ٹکٹ مانگا۔ مٹھی بھر ریزگاری دیکھ کر کلرک بگڑ گیا۔ "روپیہ لے آؤ۔ ہم کب تک اس کو گنتے رہیں گے" اس نے کہا اور دوسرے مسافر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

دیہاتی آدمی کھڑکی سے نکل کر باہر آگیا۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آیا۔ میں اس کے قریب گیا اور اس سے کہا کہ یہ ریزگاری مجھ کو دے دو اور اس کے بدلے مجھ سے نوٹ لے لو۔ دیہاتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر خاموشی سے ایک طرف روانہ ہوگیا۔

دیہاتی نے میری پیش کش کیوں قبول نہ کی۔ اس کی وجہ بے اعتمادی ہے۔ ہم ایک ایسے سماج میں ہیں جہاں کسی کو دوسرے پر بھروسہ نہیں۔ آج اگر کوئی شخص کسی پر مہربان ہوتا ہے تو صرف اپنے فائدہ کے لئے نہ کہ حقیقۃً دوسرے کی مدد کے لئے۔ دیہاتی نے غالباً یہ سوچا کہ میرے پاس کچھ خراب نوٹ ہوں گے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ان کو دیہاتی کی ریزگاری سے بدل لینا چاہتا ہوں۔

یہ ایک کی بے غرضی کا امتحان ہے اور دوسرے کی فیاضی کا

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیمٰھم لا یسئلون الناس الحافا وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم ۔ الذین ینفقون اموالھم باللیل والنھار سرا و علانیۃ فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (بقرہ ۲۷۳ - ۲۷۴)

دینا ہے ان حاجت مندوں کو جو گھر گئے ہیں اللہ کی راہ میں ۔ چل پھر نہیں سکتے زمین میں ۔ ناواقف ان کو غنی خیال کرتا ہے ۔ تم ان کے چہرہ سے ان کو پہچان لوگے ۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے ۔ اور جو مال تم خرچ کروگے وہ اللہ کو خوب معلوم ہے ۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال رات دن کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے ۔ ان کے لئے نہ ڈر ہے نہ غم ۔

انفاق کے حکم کے ذیل میں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے وسعت دی ہے ان کے لئے خرچ کی سب سے بڑی مد وہ لوگ ہیں جو دین کی خدمت میں لگنے کی وجہ سے ایسا گھر گئے ہیں کہ معاشی جدوجہد کے لئے وقت نہیں نکال سکتے ۔ ایسے لوگوں کو خدا کا دین ایک طرف اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح معاش کی فراہمی کے لئے دوڑ دھوپ کرسکیں ۔ دوسری طرف یہی دین ان کے اندر توکل علی اللہ کا جو مزاج پیدا کرتا ہے ، وہ اس کے لئے مانع بن جاتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی یا دینی ضرورتوں کے لئے ہر ایک سے کہتے پھریں ۔ ان کی متوکلانہ باتیں اکثر لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہیں ۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ مستغنی ہیں ، ان کو پیسہ کی ضرورت نہیں ۔

تاہم وہ لوگ جن کو اللہ نے ایمان کی روشنی عطا کی ہے ، وہ ظاہری پردوں کو پھاڑ کر خدا کے ان بندوں کو دیکھ لیتے ہیں ۔ وہ جان لیتے ہیں کہ یہ دنیا امتحان کا مقام ہے ۔ یہاں "لینے والوں" کی بے غرضی کا امتحان ہو رہا ہے اور "دینے والوں" کی فیاضی کا امتحان ۔ ایک سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے آپ کو دین کی خدمت میں اس طرح جھونک دے کہ اس کے پاس پیسہ کمانے کا وقت نہ رہے اور دوسرے سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے خرچ کی سب سے بڑی مد اپنی ذات کو نہیں بلکہ خدا کے دین کو سمجھے اور اپنی کمائی کو اس قسم کے خادمان دین پر قربان کردے ۔ ایک کا کمال یہ ہے کہ اپنی ضرورت مندی کو چھپائے اور دوسرے کا کمال یہ ہے کہ بظاہر چھپے ہونے کے باوجود اس کی ضرورتوں کو جان لے ۔ ایک اگر اپنی تمام توانائیوں سمیت خدا کی طرف دوڑ رہا ہو تو دوسرا خدا کی طرف دوڑنے والوں کے پیچھے اپنا سرمایہ لئے پھرتا ہو ـــــ جن لوگوں کے رات اور دن ، جن کی خلوتیں اور جلوتیں اس طرح اللہ کے لئے وقف ہو جائیں ، وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آکر خدا کو دیکھ رہے ہیں ۔ وہ اپنی ضرورتوں سے اوپر اٹھ کر دین کی ضرورتوں کو جانتے ہیں ۔ ایسے لوگوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی مالی قربانیوں کا بے حساب گنا بدلہ دے گا اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جہاں وہ ہر قسم کے اندیشوں سے بے خوف ہو کر خوشیوں کی لازوال دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس سے نکلنا نہ چاہیں گے ۔

"روزہ نماز" زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے جو چھنگلیا کی طرح آدمی کے ہاتھ میں شامل رہے۔ بلکہ وہی اصل زندگی ہے۔ روزہ نماز کو آدمی کی پوری ہستی میں شامل ہونا چاہئے نہ کہ اس طرح جیسے کوئی وقتی رسم ادا کی جاتی ہے۔

آدمی حقیقۃً کیا ہے، اس کو دیکھنے کی جگہ عبادتی مراسم نہیں ہیں۔ بلکہ آدمی کی اصل زندگی ہے ——— اگر اس کی مجلسی باتیں وہی ہوں جو عام دنیا داروں کی ہوتی ہیں۔ اگر اس کے اخبار میں وہی باتیں چھڑی رہتی ہوں جو عام قومیں اپنے اخباروں میں چھیڑے رہتی ہیں۔ اگر اس کے پاس بھی وہی نعرے اور مطالبے ہوں جو دوسروں کے پاس ہوتے ہیں۔ اس کی بحثوں اور گفتگوؤں اور دوسروں کی بحثوں اور گفتگوؤں میں اس کے سوا کوئی فرق نہ ہو کہ دوسرے لوگ جو بات اپنی روایتی اصطلاحوں میں کہتے ہیں، وہ ان کو اپنی روایتی اصطلاحوں میں بیان کر رہا ہے، اگر ایسا ہو تو اس کی نماز قرآن کے الفاظ میں غفلت کی نماز (ماعون) کہی جائے گی۔ یعنی نماز روزہ کے ذریعہ وہ جس قسم کی زندگی گزارنے کا اقرار کرتا ہے، حقیقی عملی زندگی میں وہ ان کو نہیں اپناتا۔

ذکر کوئی رٹے ہوئے منتروں کا جاپ نہیں ہے۔ ذکر اللہ کی یاد کا نام ہے جو قلب و روح کی گہرائیوں سے ابلتا ہے اللہ سے خوف، اللہ سے محبت، اللہ پر اعتماد، اللہ کو اپنا سب کچھ سمجھنا، جب کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کا سینہ اللہ کی یاد سے بھر جاتا ہے۔ اللہ کے کلمات اس کی زبان و قلب سے امڈتے رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ سے دعاؤں اور سرگوشیوں میں مشغول رہتا ہے ——— اللہ کے ساتھ اس قسم کے مستقل ربط constant touch میں رہنے کا نام ذکر ہے۔

وعظ کون کرے

ایک بزرگ نے فرمایا کہ "وعظ وہ شخص کرے جس کو وعظ کا کم سے کم اتنا تقاضا ہو جتنا ایک شخص کو رفع حاجت کا ہوتا ہے"۔ یہ بات تحریر اور تقریر دونوں کام پر صادق آتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اتنا زیادہ مطالعہ کرے کہ معلومات اس کے ذہن سے ابلنے لگیں۔ متعلقہ موضوع پر جو ذخیرہ کتب خانوں میں موجود ہے، ان کو چھاننے کے بعد وہ بے تابانہ محسوس کرے کہ اب بھی کچھ لکھنے سے رہ گیا ہے۔ اس کا حال یہ ہو جائے کہ اس کی معلومات تھامے نہ تھمیں اور اس کی بے تابی روکے نہ رکے۔ اس وقت اس کو بولنے یا لکھنے کے لئے اٹھنا چاہئے۔ اس کے بغیر جو لوگ "لاؤڈ اسپیکر" استعمال کریں گے وہ صرف فضائی شور و غل (Noise Pollution) میں اضافہ کریں گے۔ اور اس کے بغیر جو لوگ قلم سنبھالیں گے وہ صرف سفید کاغذ کو سیاہ کرنے کا کارنامہ انجام دیں گے۔ اس قسم کے مشاغل سے ممکن ہے کسی کے سطحی ذوق کو تسکین ملتی ہو مگر اس کا کوئی حقیقی فائدہ نہ سننے والے کو ملتا ہے اور نہ سنانے والے کو۔

مذہب اور جدید چیلنج

از

مولانا وحید الدین خاں

قیمت تیرہ روپے پچاس پیسے

یہ "علم جدید کا چیلنج" کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔

اس کتاب کا عربی ایڈیشن "الاسلام یتحدی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو قاہرہ کی جامعۃ الازہر کے نصاب میں ایک "مددگار کتاب" کی حیثیت سے داخل ہے۔

اسی طرح طرابلس یونیورسٹی نے اس کو اپنی تمام فیکلٹیوں میں "ثقافت اسلامیہ" کے موضوع کے تحت بی اے اور بی ایس سی کے پہلے اور دوسرے سال کے طلبہ کی تعلیم کے لئے مقرر کر دیا ہے۔

تجدید دین

از

مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۴۸

قیمت دو روپے

تاریخ کا سبق

از

مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۴۸

قیمت دو روپے

مکتبہ الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

یہ بے حسی کیوں

مجھ کو جب یہ حکم ملا کہ اس وقت کی مجلس میں مجھے کچھ کہنا ہے، تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا بات ہے جو مجھے آپ سے کہنی چاہئے۔ یہ چونکہ نصیحت، یا قرآن کے الفاظ میں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی مجلس ہے، اس لئے اس مناسبت سے بہت سی باتیں ذہن میں آئیں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سوال نے میرے سلسلۂ خیال کو توڑ دیا ——— "تم جو باتیں سوچ رہے ہو کیا وہ سننے والوں کے لئے نئی ہیں، کیا ان کے کان بار بار یہ آوازیں نہیں سن چکے ہیں۔ پھر جن الفاظ نے اس سے پہلے کوئی اثر نہیں دکھایا، وہی الفاظ ایک مرتبہ اور دہرا دینے سے کیا انقلاب آجائے گا"۔ اس سوال کا آنا تھا کہ میرے سارے خیالات اس طرح منتشر ہوگئے جیسے یکایک ہوا کا تیز جھونکا آئے اور تنکوں اور پتّوں کے ڈھیر کو اڑا لے جائے۔

اب میں دم بخود تھا۔ "آخر اس بے حسی کی وجہ کیا ہے"، یہ سوال میرے سامنے گھومنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ساری باتیں کہہ ڈالی ہیں اور اب میرے پاس آپ سے کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ میری مثال اس مقرر کی سی ہوگئی جو اپنی پوری تقریر ختم کر چکا ہو۔ مگر ساری قوت صرف کرنے کے بعد آخر میں جب وہ حاضرین سے کہے کہ لگائیے نعرہ "انقلاب زندہ باد"، تو سامنے بیٹھے ہوئے ہزاروں انسانوں میں سے کسی ایک کی زبان بھی حرکت میں نہ آئے۔ وہ بار بار کہے کہ "لگائیے نعرہ"، مگر ہر شخص اس طرح خاموش بیٹھا رہے گویا کسی کے منھ میں زبان ہی نہیں ہے۔ عین اس وقت مجھے دور سے ایک آواز سنائی دی۔ مجھے نظر آیا کہ امام ترمذی سے لے کر کعب بن عیاض تک انسانوں کی ایک جماعت ایک دوسرے کو پکار رہی ہے کہ آخری رسول کا یہ پیغام اس بندۂ خدا تک پہنچا دو، کیوں کہ اسی پیغام میں اس کے سوال کا جواب ہے:

حدثنا احمد بن منیعٍ نا الحسن بن سوّار نا لیث بن سعد عن معاویۃ بن صالح عن عبد الرحمٰن بن جبیر بن نفیر حدثہ عن ابیہ عن کعب بن عیاضٍ قال سمعتُ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان لکل امہ فتنۃً وفتنۃ امتی المال (ترمذی، ابواب الزہد)

امام ترمذی سے کہا احمد بن منیع نے، ان سے کہا حسن بن سوار نے، ان سے کہا لیث بن سعد نے، ان سے کہا معاویہ بن صالح نے، ان سے کہا عبد الرحمٰن بن جبیر نے، ان سے کہا ان کے باپ نے، ان سے بیان کیا کعب بن عیاض نے، انھوں نے کہا کہ میں نے سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا ۔ ہر امت کا ایک فتنہ تھا اور میری امت کے لئے جو چیز فتنہ بنے گی وہ مال ہے۔

اس فقرے میں "مال"، دراصل "دنیا" کا قائم مقام ہے۔ کیوں کہ دنیا کی وہ تمام چیزیں جن کو عاجلہ پسند انسان للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے وہ مال ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ مال دنیا کے ساز وسامان کی قیمت ہے۔ جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، یہی دنیا ہر زمانے میں انسانوں کی گمراہی کا سبب رہی ہے۔ مگر بعد کے دور

نیں یہ فتنہ پوری شدت سے ظاہر ہونے والا تھا۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خاص طور پر امت اسلامیہ کا فتنہ قرار دیا۔ پہلے آدمی جن لذائذ ونعم کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا وہ آج سائنسی تحقیقات کے نتیجہ میں واقعہ بن کر انسان کو حاصل ہوچکی ہیں۔ یہی نہیں، پہلے دنیا کی جو رنگینیاں اور اس کے دل کش ساز و سامان صرف کسی بادشاہ کے محل میں ہوتے تھے، وہ آج خوب صورت الماریوں میں سجے ہوئے بازار کے اندر نظر آتے ہیں، وہ آج در و دیوار پر رنگین اشتہارات کی صورت میں لگے ہوئے ہیں، وہ پوری رعنائی کے ساتھ سڑکوں پر ظاہر ہوکر ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا اس سے پہلے کبھی اتنی حسین نہیں تھی، اس لئے وہ اس سے پہلے انسان کے لئے اتنا بڑا فتنہ بھی نہیں بن سکتی تھی۔

یہاں میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جو ابھی حال میں اخبارات میں آیا تھا۔ نئی دہلی میں ہندستان کے بین اقوامی صنعتی میلہ میں امریکہ کی طرف سے ایک ہوائی موٹر کار کی نمائش کی گئی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمین پر بھی چلتی ہے اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں بھی اڑ سکتی ہے۔ اس عجیب و غریب کار کو جب ایک نوجوان سادھو نے دیکھا تو اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا "کیا میں تیاگ اور قربانی کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیات کی دنیا میں اپنے حوصلوں کی تسکین ڈھونڈوں"، سادھو نے کہا۔ گیروے کپڑے میں ملبوس اور لمبے بکھرے ہوئے بالوں والا یہ ہندستانی نوجوان بیس منٹ تک اس امریکی کار کو دیکھتا رہا جس کو نمائش کے ذمہ داروں نے مستقبل کی کار (Car of the Future) کا نام دیا ہے۔ جب اس کے بارے میں سادھو کا تبصرہ پوچھا گیا تو اس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا "اس نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ دونوں دنیاؤں میں سے وہ کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھوں" (ہندستان ٹائمس ۲۰ نومبر ۱۹۶۱) یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مادی ساز و سامان نے آج کس طرح ہر شخص کو اس خطرے میں مبتلا کردیا ہے کہ وہ ان کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہوکر زندگی کی اصل حقیقت کو بھول جائے۔

اس حدیث سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ امت محمدیہ کے افراد میں جب کوئی کمزوری نظر آئے تو اس کے اسباب سب سے پہلے دنیا کے فتنوں میں تلاش کرنے چاہئیں۔ جب اس امت کا فتنہ دنیا ہے تو امت کی خرابیاں بھی دنیا ہی کی پیدا کی ہوئی ہوں گی۔ جب میں نے اس حیثیت سے غور کیا تو بالآخر میرا ذہن اس پر مطمئن ہوگیا کہ دنیا ہی وہ سب سے بڑا روک ہے جو حق کی آواز کو آدمی کے لئے قابل فہم اور قابل قبول بننے نہیں دیتا۔ اسلام کی بلند تر حقیقتوں کو وہی شخص پا سکتا ہے جو دنیا اور دنیا کی چیزوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھا چکا ہو۔ جو اس سے اوپر نہ اٹھ سکے اس کے عین سر کے اوپر حقیقت کی آواز گونج رہی ہوگی مگر اس کو گرفت کرنے کی طاقت سے وہ محروم ہوگا۔ اس کے پاس وہ کان نہیں ہوں گے جن سے وہ سنے اور وہ دل نہیں ہوگا جن سے وہ اسے سمجھے آپ کی سعادت و ترقی کے تمام امکانات اس وقت تک آپ سے دور رہیں جب تک آپ کی توجہات دنیا کے اندر بکھری ہوئی ہوں۔ آپ کا مومن بننا، آپ کا داعی بننا، آپ کا مجاہد فی سبیل اللہ بننا، سب کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس

سے پہلے آپ "زھد فی الدنیا"، کی کیفیت اپنے اندر پیدا کر چکے ہوں جو رسول کے الفاظ میں — اول صلاحِ هٰذه الامة ہے۔ دنیا پسندی دوسرے لفظوں میں ظاہر پسندی کا نام ہے۔ اور زھد یہ ہے کہ ظاہری چیزوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے وہ آدمی کے سامنے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا پسندی سطحیت پیدا کرتی ہے اور زھد سے وہ گہری نظر حاصل ہوتی ہے جو چھپے ہوئے واقعات کو بالکل بے نقاب دیکھ لے۔ اور حقیقت سے انتہائی حد تک آشنا ہو کر بول سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما زھد عبدٌ فی الدنیا الا انبت اللہ الحکمۃ فی قلبہ وانطق بھا لسانہ وبصرہٗ عیب الدنیا وداءھا ودواءھا واخرجہ سالما الی دار السلام (بیہقی فی شعب الایمان)

جو شخص دنیا سے بے رغبت ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت پیدا کر دیتا ہے اور اس کی زبان پر کلماتِ حکمت جاری کر دیتا ہے۔ دنیا کے عیب اور اس کا مرض اور علاج اسے دکھا دیتا ہے۔ اور اس کو سلامتی کے گھر (جنت) تک محفوظ لے جاتا ہے۔

یہ حکمت جو زُہد کے صلے میں ملتی ہے، یہ خدا کی سب سے بڑی دین ہے جس کو قرآن میں "خیر کثیر"، کہا گیا ہے یعنی سب سے بڑا خزانہ۔ قرآن کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمت کا خزانہ اسی کو ملتا ہے جو دوسرے خزانوں سے اپنی نظریں ہٹا لے، جو دنیا کی محبت سے اپنے دل کو خالی کر چکا ہو۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

یُؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیراً

اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت دی گئی اس کو سب سے بڑا خزانہ دے دیا گیا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "خیر کثیر"، اسی کو ملتا ہے جو "خیر قلیل" سے اپنے آپ کو خالی کر لے، جو خیر قلیل میں لپٹا ہوا ہو، وہ خیر کثیر سے اپنا دامن نہیں بھر سکتا۔

میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں اسی زُہد فی الدنیا کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ کیوں کہ اپنے مطالعہ اور تجربہ سے میں اس حقیقت پر مطمئن ہو چکا ہوں کہ جب تک کسی کے اندر زُہد کی کیفیت پیدا نہ ہو وہ دین کی اعلیٰ حقیقتوں کا ادراک نہیں کر سکتا اور نہ اس کے اندر کبھی گہرا عمل پیدا ہو سکتا۔ جس شخص کی آخرت طلبی نے اس کو دنیا کا زاہد نہیں بنایا، اس کے درمیان اور قرآن کے درمیان ایک "حجابِ مستور"، حائل رہتا ہے۔ وہ سنتا ہے مگر نہیں سنتا، وہ سنتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔ (بنی اسرائیل ۴۶-۴۵)

زہد فی الدنیا کے معنی ہیں دنیا سے بے رغبتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا سے دل چسپی کا تعلق ختم کر کے اس سے صرف ضرورت کا تعلق باقی رکھا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں التجافی من دار الغرور کہا گیا ہے۔ (دھوکا دینے والی جگہ سے دور رہنا) اس دوری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا کے کاروبار سے

الگ تھلگ ہو جائیں۔ زہد دراصل دنیا سے حیاتی بے تعلقی کا نام ہے نہ کہ عملی بے تعلقی کا۔ جیسا کہ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا، زہد خراب کپڑے اور معمولی کھانے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے جو دل کے اندر پیدا ہوتی ہے ظاہری شکلیں اس اندرونی کیفیت کا فطری اظہار ہیں، نہ کہ بجائے خود کسی ظاہری شکل کا نام زہد ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص جھونپڑی میں رہتا ہو مگر اپنے خیالات و احساسات کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ایک دنیا پسند آدمی ہو۔ اور دوسرا شخص اپنے آپ کو عالی شان عمارتوں کے درمیان پائے مگر دنیا پسندی سے اس کا ذہن خالی ہو۔

زہد کسی مصنوعی تدبیر کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ آدمی کی ایمانی حالت کا ایک فطری اظہار ہے۔ جب کوئی شخص اعلیٰ حقیقتوں کو پالیتا ہے تو اسفل حقیقتیں خود بخود اس کی نگاہ میں حقیر بن جاتی ہیں۔ اُخروی قدروں کی اہمیت کا احساس دنیوی قدروں کو غیر اہم بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی ایمانی کیفیت کے بالکل لازمی نتیجے کے طور پر دنیا سے بے رغبت ہو جاتا ہے۔ جب آپ کا ذہن خدا کی باتیں سوچنے میں اتنا مصروف ہو کہ آپ دنیا کی باتیں بھولنے لگیں، جب آخرت کی فکر آپ کے اوپر اس طرح چھا جائے کہ دنیا کے غم آپ کو یاد نہ آئیں، جب آنے والے مستقل آرام و تکلیف کا مسئلہ آپ کو اتنا فکرمند بنا دے کہ عارضی آرام و تکلیف کے مسئلے آپ کے لئے بے حقیقت ہو جائیں۔ جب کل کی زندگی آپ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے کہ آج کی زندگی کے بارے میں آپ لوگوں کو غافل نظر آنے لگیں، جب بلند تر حقائق کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے آپ دنیا میں اس طرح رہنے لگیں گویا آپ دنیا میں نہیں ہیں۔ جب دنیا میں آپ کوئی آرام دیکھیں تو یہ سوچ کر رو پڑیں کہ معلوم نہیں کہ آخرت میں کیا ہونے والا ہے اور جب کوئی تکلیف ستائے تو آپ کی زبان سے نکلے کہ "خدایا دنیا کی معمولی تکلیف کا یہ حال ہے تو آخرت میں کیا ہوگا"، جب دنیا کی لذتیں آپ کو تسکین نہ دے سکیں اور دنیا کی زحمتیں آپ کی نگاہ میں حقیر بن جائیں —— جب آپ کا حال یہ ہو جائے تو اسی کا نام زھد فی الدنیا ہے۔ آنحضور صلعم نے ایک بار اپنے صحابی حضرت عبد اللہ بن عمر رضہ کو پکڑ کر جو نصیحت فرمائی تھی، اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

عُدَّ نفسكَ مِنْ اهل القبور (بخاری) — اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو

گویا اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو دنیا میں بھیجا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم یہاں کی نعمتوں میں غرق ہوں اور یہاں رہ کر اپنے دل کی تمنائیں پوری کریں۔ بلکہ وہ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم میں سے کون ہے جو دنیا کو اپنے حوصلوں اور تمناؤں کا قبرستان بناتا ہے۔

اس تشریح سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زہد صرف محرمات دنیا سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی حالت ہے جس میں آدمی کو بہت سی جائز چیزوں سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لینا پڑتا ہے۔ بے شک جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے وہی حرام ہے اور جو کچھ اس نے حلال کیا ہے وہ سب حلال ہے۔ کسی انسان کو حق نہیں کہ اس میں بال برابر کوئی رد و بدل کر سکے۔ مگر شریعت کی قانونی حدود ہمارے ارتقا کی آخری حدود نہیں ہے۔ دائرہ ایمان میں داخل ہونے کے لئے یقیناً صرف اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی احکام کے قانونی تقاضے پورے کر دے۔ مگر ایمان کے اعلیٰ

مراتب کو حاصل کرنے کا ذریعہ قانون نہیں، قربانی ہے، اگر آپ خدا کی راہ میں مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں تو آپ کو اپنی نیند، اپنا آرام، اپنی لذتیں، سب کچھ چھوڑنی پڑیں گی، ذوق اور عادت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا ہوگا۔ حالاں کہ یہ سب کچھ آپ کے لئے جائز ہے اور ان میں سے کوئی بھی چیز شریعت نے حرام نہیں قرار دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام راہوں کی طرح اسلام کی راہ میں بھی ترقی صرف اسی کے لئے ہے جو قانونی تقاضوں سے بلند ہو کر کام کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو یہ نہ دیکھتا ہو کہ دنیا کی چراگاہ میں اس کے لئے کیا کیا جائز ہے بلکہ جس کی نگاہ اس پر لگی ہوئی ہو کہ کتنے عظیم امتحان میں اسے پیش ہونا ہے اور اس کے لئے کتنی بے پناہ تیاریوں کی ضرورت ہے۔ ایسا شخص یقیناً بہت سی ایسی چیزوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائے گا جو اس کے لئے شرعاً حلال تھیں۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لا يبلغ العبد ان يكون من المتقين حتى يدع مالا باس به حذرا لما به باس (ترمذی، ابن ماجہ)	کوئی شخص متقیوں میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ ان چیزوں کو چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایسی چیزوں سے بچنے کی خاطر جن میں واقعتاً حرج ہے۔

اس "چھوڑنے"، کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ ہوں۔ دوسرے، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ نہ ہوں مگر ان کے متعلق یہ شبہ ہو کہ وہ آدمی کو غلط انجام تک پہنچا سکتی ہیں۔

پہلی صورت میں متعلقہ چیز کی حرمت کا یقین تو نہیں ہوتا مگر اس کی حلت کے بارے میں بھی ذہن پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ اس لئے آدمی احتیاط کی بنا پر اسے ترک کر دیتا ہے۔ دوسری صورت میں متعلقہ چیز اصلاً بالکل جائز ہوتی ہے مگر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے نتائج پیدا کرے گی جو صحیح نہ ہوں۔ مثلاً دنیا کا عیش و آرام فی نفسہ بالکل جائز ہے۔ مگر ایک حساس مومن ان سے صرف اس لئے بچتا ہے کہ وہ ڈرتا ہے کہ اس میں پڑ کر اس کا نفس موٹا ہو جائے گا۔ اس کے درمیان اپنے آپ کو پاکر وہ اور اس کے اہل خاندان غلط قسم کے احساس برتری میں مبتلا ہو جائیں گے، دنیا کی آسودہ زندگی "کامیابی" کا غلط احساس پیدا کرے گی اور اس طرح آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کی فکر نفسیاتی طور پر مضمحل ہو جائے گی۔

زہد فی الدنیا سے وہ انسان کیسے بنتا ہے جو ترقی کے اعلیٰ مراتب طے کر سکے، اس کے بہت سے پہلو ہیں، میں یہاں چند خاص پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔

ا۔ زہد فی الدنیا سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان میں پہلی چیز وہ ہے جس کو میں استغراق یا ذہنی یک سوئی کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ دنیا سے جتنا زیادہ آپ کا تعلق ہوگا اتنا ہی زیادہ آپ کے خیالات منتشر ہوں گے، اور یہ تعلق جتنا کم ہوگا اتنا ہی آپ اپنے خیالات کو یک جا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ حقیقت ایک نہایت لطیف چیز ہے اس لئے اس کو گرفت کرنے کے لئے غیر معمولی ذہنی ارتکاز بہت ضروری ہے جس نے اپنی فکر کو مختلف سمتوں میں پھیلا

رکھا ہو وہ ہرگز اعلیٰ حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔ تاریخ سائنس کا عظیم ترین نام "نیوٹن" اپنے پیچھے جو عظمت رکھتا ہے اس کا سب سے بڑا راز نیوٹن کا ذہنی استغراق تھا۔ وہ اپنے بچپن میں Wool Gatherer کہا جاتا تھا۔ یعنی کھویا ہوا شخص۔ لوگ اسے نیوٹن کا طبعی نقص سمجھتے تھے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ اس کی یہ کیفیت اس کی استغراقی صلاحیت کی وجہ سے تھی۔ وہ کسی مسئلہ خاص پر ذہن کو بالکل مرتکز کر کے سوچنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ بہت جلد مسائل کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اور انتہائی پیچیدہ سوالات جن کے حل کرنے میں دوسرے لوگ مہینوں لگا دیتے تھے وہ انھیں گھنٹوں میں حل کر کے رکھ دیتا تھا۔

اگر آپ اس کے کمرے میں داخل ہوں تو آپ کے سامنے کتابوں اور کاغذات کی ایک بے ترتیب دنیا ہوگی جس میں کسی اہتمام کے بغیر ایک شخص اس طرح کھڑا یا بیٹھا ہوا نظر آئے گا جیسے وہ کوئی مجسمہ ہے جو کسی اسکیم کے بغیر اس ڈھیر میں لاکر ڈال دیا گیا ہے۔ مشہور سائنس داں اڈمنڈ ہیلی (Edmund Halley) جس کے نام پر ایک دمدار ستار کا ہیلی کامٹ (Halley Comet) کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ دمدار ستارہ معلوم تو کر لیا تھا مگر اس کے مدار کا حساب لگانے میں وہ کوشش کے باوجود ناکام رہا۔ اس سلسلے میں مدد لینے کے لئے وہ نیوٹن کے پاس گیا۔ وہاں یہ سن کر اسے سخت حیرت ہوئی کہ الجھے ہوئے بالوں والا یہ آدمی اس کو پہلے ہی حل کر چکا ہے۔ اس نے اس کا حساب دیکھنا چاہا۔ مگر یہ نیوٹن کا کمرہ تھا۔ کوشش کے باوجود بکھرے ہوئے بے ترتیب انبار میں متعلقہ کاغذ برآمد نہ ہو سکا۔ نیوٹن نے فوراً ہی ایک سادہ کاغذ لیا اور اس انتہائی پیچیدہ ریاضیاتی سوال کو دوبارہ حل کر کے اسی وقت ہیلی کے سامنے رکھ دیا۔ ہیلی اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا جب اسے معلوم ہوا کہ نیوٹن کی تصنیف Principia ابھی تک اس کے ڈسک کے ایک خانہ میں ردی کاغذات کی طرح بھری ہوئی رکھی ہے، تو اس نے کہا کہ ایسے قیمتی دماغ کے افکار اس طرح پڑے رہنے کے لئے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے خرچ سے اس کو چھپوانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح نیوٹن کی یہ کتاب پہلی بار دنیا کے سامنے آئی۔

نیوٹن صرف مادی دنیا کے کچھ حقائق جاننا چاہتا تھا، اس کے لئے اُسے اس طرح مستغرق ہونا پڑا کہ وہ اپنا کھانا، اپنا سونا، اپنا آرام، اپنا ذوق، اپنی عادتیں، سب بھول گیا۔ تو آپ جن غیر مادی حقائق کا تصور اپنے ذہن میں جمانا چاہتے ہیں، ان کو شدید ذہنی استغراق کے بغیر کس طرح پا سکتے ہیں۔ آسمان پر جو ستارے جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی حرکت کے قوانین منضبط کرنے کے لئے نیوٹن کو افکار میں اتنا ڈوبنا پڑا گویا اس نے اپنے آپ کو دنیا سے اٹھا کر اسی خلا میں پہنچا دیا ہے جہاں یہ روشن اجسام حرکت کر رہے ہیں۔ پھر وہ حقیقتیں جو ستاروں سے بھی دور ہیں، جو ٹمٹماتی ہوئی شکل میں بھی آنکھوں کو نظر نہیں آتیں، ان کو بے پناہ ذہنی یکسوئی کے بغیر کیسے گرفت کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ اس طرح خدا کی عبادت کریں گویا کہ آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ قیامت اور جنت دوزخ کا تصور ہر وقت آپ کی نگاہوں کے سامنے رہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایسے ہو جائیں کہ آپ جہاں ہوں اور جو کام بھی کر رہے ہوں، ہر حال میں آپ کا سینہ "ذکر کثیر" سے لبریز رہے۔ اگر آپ اپنے اندر

وہ شدید یقین اور وہ زبردست استحضار دیکھنا چاہتے ہیں جو دل کو پگھلا دے اور آنکھوں کو اشکبار کردے تو یہ سب کچھ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آپ حدیث کے الفاظ میں "تشعّب ہموم"، کو ختم کرکے اپنی ساری نظریں صرف ایک نقطہ پر لگا دیں۔ ارجن کے مشہور واقعہ کی طرح آپ کو درخت اور چڑیا اور پتے اور پھل نظر نہ آئیں بلکہ صرف ایک چیز نظر آئے ـــــ "شکار کی بائیں آنکھ"

جب آپ یہ ذہنی گم شدگی اور یہ استغراق اپنے اندر پیدا کریں گے تو عادت اور ذوق کے تقاضے آپ کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوں گے، لذتوں اور آسائشوں کا خیال مدھم پڑ جائے گا۔ فکر کی زیادتی جسمانی تقاضوں پر غالب آنے لگے گی۔ آپ کا ہنسنا اور بولنا کم ہو جائے گا، تصوراتی دنیا کو پانے کی کوشش میں آپ مادی دنیا سے دور ہوتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس وقت ممکن ہے لوگ کہیں تم پاگل ہو گئے ہو۔ مگر اس سے گھبرائیے نہیں، کیونکہ یہی وہ صحیح ترین خطاب ہے جو کسی بامقصد آدمی کو اہلِ دنیا کی طرف سے دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ زہد فی الدنیا کے ذریعہ دوسری چیز جو حاصل ہوتی ہے وہ لطافت روح ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مادی دنیا میں آدمی جتنا زیادہ مشغول ہو گا۔ اس کی روح میں اسی قدر کثافت پیدا ہو گی۔ اور جتنا وہ اس سے اپنے آپ کو دور لے جائے گا اسی کے بقدر اس کی روح پاک اور خالص ہوتی چلی جائے گی۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں رہبانیت کی تبلیغ کر رہا ہوں، رہبانیت دنیا سے اپنے آپ کو الگ کر لینے کا نام ہے حتیٰ کہ اس مقصد سے اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مار ڈالے تو یہ بھی رہبانی فلسفہ کے مطابق جائز ہو گا۔ اس کے برعکس زہد یہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر اسی دنیا میں ہو۔ مگر اس سے بے رغبت ہو چکا ہو وہ دنیا میں رہتے ہوئے ذہنی حیثیت سے اس سے باہر نکل جائے۔ مومن بھی یقیناً راہب ہوتا ہے۔ مگر اس کی رہبانیت حسی رہبانیت ہے جب کہ دوسرے مذاہب جسمانی رہبانیت میں عقیدہ رکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے کسی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے"، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے احساسات کسی ایک ہی چیز کے بارے میں شدید ہو سکتے ہیں۔ وہ دو سمتوں میں حرکت نہیں کر سکتے۔ اگر آپ دنیا اور اس کے ساز و سامان کو اہمیت دینے لگیں تو آخرت کا خیال آپ کے اندر کمزور پڑ جائے گا اور اگر آپ آخرت کی فکر میں مشغول ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ دنیا کے بارے میں آپ پر غفلت طاری ہونے لگے گی۔ جو شخص دنیوی قدروں کو اہمیت دیتا ہے، اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ اُخروی قدروں کو پامال کر رہا ہے۔ آپ کو ایسے "خوش مذاق" ملیں گے جن کے کھانے کی پلیٹ میں مکھی پڑ جائے تو وہ اس کو کھانا پسند نہیں کریں گے۔ دوسری طرف ان کے اسلام میں کتنی ہی مکھیاں پڑی سڑ رہی ہوں گی۔ مگر اس کی عفونت کا انھیں اندازہ نہ ہو گا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی طرف رغبت نے آدمی کی حسیات کو دنیا کے بارے میں تو بہت تیز کر دیا، مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرت کے بارے میں اس کی حسیات کند ہو کر رہ گئیں۔

یہ دنیا جو آپ کے جسم کو موٹا کرتی ہے۔ یہ آپ کی روح کی قاتل ہے۔ اگر آپ اس کے اندر لذت ڈھونڈنے

لگیں، اگر اس کے سطحی اور ظاہری ساز و سامان آپ کو اپنی طرف کھینچ لیں، تو وہ آپ سے آپ کا سب سے بڑا جوہر چھین لیں گے۔ اس کے بعد آپ کے نازک جذبات مردہ ہو جائیں گے، آپ کے اندر وہ لطیف احساسات ابھر نہیں سکتے جو اعلیٰ ترین حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔ جن پر تجلیات الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ جس کے بعد آدمی تمام حجابات سے بلند ہو کر حقیقت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے جس کے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا نہیں ہوئی، اس کے اندر گویا وہ صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی جو کسی حقیقت کو سمجھے اور اسے قبول کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسے دل میں حکمت کا "انبات" نہیں ہو سکتا۔ جس زمین میں اخذ کی صلاحیت نہ ہو وہ کیسے کسی بیج کو قبول کرے گی اور اس کے اندر ڈالا ہوا دانہ نشوونما پا کر پورا درخت کیسے بن سکتا ہے۔ یاد رکھئے، حقیقت ایک غیر مادی چیز ہے۔ اس لئے وہ روح جو مادی آلائشوں میں پھنسی ہوئی ہو، وہ حقیقت کو بے نقاب حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا مشاہدہ ہمیشہ دھندلا مشاہدہ ہوگا جس میں حقیقت کے بعض رُخ دکھائی دیں گے اور بعض رخ نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔

روح کی لطافت اور کثافت کوئی تصوف کا پُراسرار مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل ایک سادہ سی حقیقت ہے جس کو ہر شخص معمولی غور و فکر سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کا جو حیاتی اور تصوراتی وجود ہے وہ کسی اور کی محبت میں اٹکا ہوا ہے یا اس نے اپنے آپ کو دوسری تمام چیزوں کی گرفت سے بالکل خالی کر دیا ہے تاکہ مالکِ حقیقی کی یاد آپ کی روح کو اپنا مسکن بنا سکے۔ گرمیوں میں اگر مسجد میں بجلی کا پنکھا چلایا جائے اور اس کی ہوا میں نماز ادا کی جائے تو ظاہر ہے کہ کوئی اسے ناجائز نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر دل اللہ کے ذکر سے خالی ہو تو یہ حال ہوتا ہے کہ مسجدوں میں نماز کے لئے آنے والے پنکھے کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے مسابقت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نماز کے دوران میں اگر کرنٹ رکنے کی وجہ سے پنکھا بند ہو جائے تو سلام پھیرتے ہی ہر شخص کی نظریں اوپر اٹھ جاتی ہیں اور نماز کے بعد پاور سپلائی کے انتظام کی خرابی وہ اہم ترین موضوع ہوتا ہے جس پر لوگ اپنے جذبات اور اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی آرام طلبی نے آپ کی روح کو گندا کر دیا۔ اس میں گرمی اور سردی کے مسائل نے اپنے آشیانے بنا لئے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی وہ نماز نہیں پڑھ سکتا جو ساری لذتوں سے بڑھ کر لذیذ ہے۔ جس میں مشغول ہو کر آدمی گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے، جب ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنی دنیا سے نکل کر خدا کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

مجھ کو بار بار اس کا تجربہ ہوا کہ ایک شخص اپنے ذوق اور اپنی عادتوں کے معاملے میں تو نہایت حساس ہے۔ اپنے طبعی تقاضوں میں کمی کو وہ کسی حال میں برداشت نہیں کرتا۔ مگر ایسے معاملات جو خدا اور آخرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اس کی دوامی زندگی کو بہتر یا بدتر بنانے والے ہیں ان میں وہ اکثر نہایت سنگین حقیقتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے گویا ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس کے سامنے آپ قرآن و حدیث کے صریح ارشادات پیش کیجئے، مگر وہ ایسے سرسری جوابات دے کر بات کو ٹال دے گا کہ آپ حیرت میں یہ سوچتے رہ جائیں گے کہ "دوبارہ ان کا کوئی جواب بھی دوں یا نہیں"، اس کی وجہ یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دنیا سے اوپر اٹھا نہیں سکا۔ اس کے ایمان بالآخرۃ نے

اس کی روح کو ابھی تک دنیا کی کثافتوں سے پاک نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی حسیات انھیں معاملات میں زیادہ کام کریں گی جہاں وہ عملاً پڑا ہوا ہے۔ مگر جس دنیا سے وہ دور رہے جہاں اس نے ابھی تک اپنے آپ کو پہنچایا نہیں اس کی حقیقتوں کو وہ کیسے گرفت کر سکتا ہے اور ان کے ذکر سے کس طرح اس کے اندر ہل چل برپا ہو سکتی ہے —— شخصیت پرستی کسی کے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند کر دے تو حق کی روشنی اس کے اندر کس راہ سے داخل ہوگی۔

اگر آپ چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھے ہوں اور یکایک تار آئے کہ آپ کے اکلوتے لڑکے کا انتقال ہو گیا، تو دوسرے لوگ جیسے پہلے تھے ویسے اب بھی رہیں گے مگر آپ تڑپ اٹھیں گے۔ آپ کی حالت بالکل بدل جائے گی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جس شخص کے متعلق خبر آئی ہے اس کی خبر سننے کے لئے پہلے سے آپ کے دل کے تمام گوشے خالی تھے اس لئے وہ سیدھی آپ کے دل میں گھس گئی۔ اس کے برعکس بقیہ لوگوں کے دل میں اس نے جاتے کا راستہ نہیں پایا کیوں کہ ان کے دل کچھ دوسرے لوگوں کی محبت سے بھرے ہوئے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جب قرآن کی "تلاوت" ہو رہی ہو۔ جب کلمات حکمت سنائے جا رہے ہوں، جب کوئی منادی کرنے والا ایمان کی منادی کر رہا ہو، تو اس کی آواز انھیں لوگوں کے دل سے ٹکرائے گی جنھوں نے اپنا سینہ اس کے لئے کھلا رکھا ہو۔ اور جس نے اپنے اندرون کو دوسری پرستشوں کا گودام بنا رکھا ہے اس پر کوئی آواز اثر نہیں کر سکتی، وہ تو اسی وقت سنے گا جب صاعقہ عظیم اس کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

۳۔ زہد کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ آپ کے لوازم زندگی میں کمی کر دیتا ہے۔ ہر بامقصد آدمی فطرتاً ایک تضاد میں مبتلا کیا گیا ہے۔ ایک طرف اس کے جسم کے تقاضے ہیں جن کی فہرست کا کوئی شمار نہیں۔ اور دوسری طرف اس کا مقصد ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ ساری توجہ اسی کی طرف لگا دی جائے۔ اس تضاد کو ہم بالکلیہ ختم نہیں کر سکتے ہماری بہترین عقل مندی یہ ہے کہ ہم اس میں کمی کی کوشش کریں۔ دنیا کے تمام وہ لوگ جنھوں نے کوئی بڑا کام انجام دیا ہے، وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے مجبور تھے کہ اپنے لوازم حیات میں ہر ممکن حد تک کمی کریں۔ آپ کے سامنے بھی ایک عظیم مشن —— دنیا کے سامنے حق کی گواہی دینے کا مشن، ہے۔ اس لئے اگر آپ اسے تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی اسی اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ البتہ اس میں اسلام کے اپنے نظریۂ زندگی کا لحاظ ضروری ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح شادی نہ کریں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح سگرٹ نہ پئیں۔ کیوں کہ شادی ایک حقیقی ضرورت ہے جب کہ تمباکو، انسان کی فطری ضرورتوں پر ایک مصنوعی ضرورت کا اضافہ ہے۔

لوازم حیات میں کمی کا یہ پہلو تو بالکل واضح ہے کہ وہ آپ کو اپنے مقصد میں زیادہ حصہ لینے کے قابل بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی دیگر ضروریات کی فہرست جتنی مختصر ہوگی، اسی کے بقدر آپ اپنے مقصد کے کاموں کے لئے زیادہ فارغ ہوں گے۔ خلا کا ایک مسافر راکٹ میں بیٹھ کر تین سو میل فی منٹ کی رفتار سے اڑتا ہے۔ مگر اس سفر میں جن بھاری ملبوسات اور مختلف قسم کے آلات سے وہ لیس ہوتا ہے، ان کو اپنے جسم پر لادے ہوئے زمین پر پیدل چلنا ہو تو وہ چند میل بھی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ کرلے جا سکے گا۔ اسی طرح اگر آپ نے اپنی زندگی کو حقیقی ضروریات

کے ماسوا اور بہت سی مزدوروں کا عادی بنالیا ہے تو ان کو لئے ہوئے آپ زمین پر نہیں چل سکتے۔ جب تک یہ لوازم آپ کے گرد مہیا ہوں آپ متحرک نظر آئیں گے۔ مگر جہاں یہ لوازم رخصت ہوئے، آپ اسی طرح اپنے آپ کو بے بس پائیں گے جیسے مغلیہ سلطنت کے آخری شہزادے پالکی کی سواری کا عادی ہونے کی وجہ سے غدر کے وقت بھاگ نہیں سکے اور ان کے دشمنوں نے محل میں گھس کر ان کے بستروں پر انھیں قتل کیا۔

مگر لوازم حیات کو مختصر کرنے کا ایک اور فائدہ ہے جو اسلامی اعتبار سے اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح کے لوازم میں جتنی کمی ہوگی اسی کے بقدر آپ کے اندر زیادہ سوز اور اخلاص پیدا ہوگا۔ اگر آپ کو ایک ہزار میل دور سے آکر یہاں تقریر کرنی ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے لئے اسپیشل سیلون میں سفر کرنا ضروری ہے تاکہ جب میں اسٹیشن پر اتروں تو بالکل تازہ دم رہوں اور جلسہ گاہ پہنچ کر اپنے موضوع پر اچھی طرح بول سکوں، بیشک آپ کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ کسی کو جرأت نہیں کہ اس کے خلاف فتویٰ دے سکے۔ بلکہ بہت سے ظاہر بینوں کو آپ کا زور خطابت اس دلیل کی معقولیت ماننے پر یہاں تک مجبور کرسکتا ہے کہ وہ آپ کے لئے مخصوص سیلون میں سفر کرنا ہی افضل سمجھنے لگیں کیونکہ اس کے بغیر اتنی شان دار تقریر وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ مگر میں کہوں گا کہ خدا کو شان دار تقریر مطلوب نہیں ہے۔ اس کو تو آپ کے دل کے ٹکڑے درکار ہیں۔ اور وہ تقریر جس میں آپ کے دل کے ٹکڑے الفاظ بن کر نکلیں، جو دوسروں کو متاثر کرنے سے پہلے خود آپ کو رلا دے، جو تقریر نہ ہو بلکہ درد اور تڑپ کا ایک مجسم اظہار ہو۔ وہ تو اسی وقت ہوتا ہے جب کہ آپ بے آرامی سے سفر کرکے یہاں پہنچے ہوں جس میں یہاں تک اپنے آپ کو لانے میں آپنے مشقت اٹھائی ہے جو آپ کے لئے محض سفر نہ ہو بلکہ خدا کی طرف بڑھنے کا ایک مجاہدہ ہو۔ ایسی ہی ایک زبان سے کلمات درد نکل سکتے ہیں۔ دردمند کلام، خدا کا ایک الہام ہے جو براہ راست عالم الغیب والشھادۃ کی طرف سے آپ کے اوپر القا کیا جاتا ہے۔ اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا الہام ایک "قول ثقیل،، ہے جو کسی ایسے قلب ہی پر اتر سکتا ہے جو "وطأ شدیدۃ" کے مرحلے سے گزر چکا ہو (سورۂ مزمل)

امام احمد اور امام ترمذی کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بار اپنے رسول کو سونے کی عظیم ترین کان دینے کی پیش کش کی، رسول نے جواب دیا، خدایا نہیں، بلکہ مجھے اس طرح رکھئے کہ کسی روز کھاؤں اور کسی روز بھوکا رہوں۔ تاکہ جب میں کھاؤں تو آپ کا شکر ادا کروں اور جب بھوک ستائے تو آپ کے سامنے گریہ و زاری کروں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی حالات کے بغیر اپنے اندر کیفیات پیدا نہیں کرسکتا۔ جو حالات سے خالی ہوجائے وہ کیفیات سے بھی خالی ہوجائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سختی اور مشقت کے لمحات اپنے اندر دوطرفہ فائدہ رکھتے ہیں۔ ایک طرف ان سے وہ "درد،، حاصل ہوتا ہے جو دل کی زندگی ہے، جو آپ کو احساس حیات سے آشنا کرتا ہے۔ جو انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو بیدار کرنے والا ہے۔ دوسری طرف مشقت کے لمحات ہی آپ کی راحت کے لمحات کو اسلامی رنگ دیتے ہیں۔ وہ آدمی کو اس قابل بناتے ہیں کہ جب وہ ایسی کوئی چیز دیکھے تو اس کا دل شکر کے جذبے سے لبریز ہوجائے۔ جو درد سے خالی ہے وہ زندگی سے خالی ہے، اور جو زندگی سے محروم ہو وہ کیسے کوئی بات سنے گا اور کیسے کوئی بات قبول کرے گا۔

۴۔ زہد فی الدنیا کا ایک اور پہلو ہے۔ وہ یہ کہ ایسا آدمی حرام اور مشتبہ چیزوں میں پڑنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ناجائز چیزوں کے ارتکاب سے وہی شخص بچ سکتا ہے جو جائز حدود میں بھی بچ کر چلتا ہے۔ جو تمام "جائز" چیزوں کو اپنا ضروری حق سمجھ لے، ایسے آدمی کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی حرام کام میں پڑ جائے۔ حدیث کے الفاظ میں، ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور خدا کی چراگاہ وہ چیزیں ہیں جن کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔ جو شخص سرحد تک اپنے مویشی چراتا ہوا پہنچ جائے اس کے لئے ہر آن یہ خطرہ ہے کہ مویشی کہیں چراگاہ کے اندر نہ گھس جائیں۔ (متفق علیہ)

عورتوں کے لئے زیب و زینت بالکل جائز ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہر وہ گھر جس نے اس جواز کو اپنے لئے کھلا دروازہ سمجھ لیا ہے، آج اس کے یہاں غیر ساتر ملبوسات اس طرح استعمال ہونے لگے ہیں کہ اب لوگوں کو شاید ان کے ممنوع ہونے کا بھی احساس نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے بے دین گھرانے اور اسلام پسند گھرانے میں بس اتنا ہی فرق رہ گیا ہے کہ ہمارے گھروں کی عورتیں اور لڑکیاں خاندان اور رشتہ کے لوگوں اور دوسرے ملنے والوں کے سامنے اپنی غیر شرعی پوشاک کا مظاہرہ کرتی ہیں اور دوسرے گھرانوں کی عورتیں اپنے اس فتنہ کو لئے ہوئے بازاروں اور سڑکوں پر نکل آئی ہیں۔

اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں جو لوگ ترقی کرتے ہیں یا بڑے عہدے حاصل کرتے ہیں وہ ضمیر کی قربانی دے کر ہی ان مناصب تک پہنچتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں کسی اونچی کرسی کو اپنی نشست گاہ بنانے کے لئے جو لیاقت درکار ہے اس میں سے ایک ضروری چیز یہ بھی ہے کہ دین کو آپ اپنے اندر سے کھرچ کر نکال دیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بادشاہوں سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں کہا تھا "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ان کی دنیا میں سے جتنا پاؤ گے اس سے زیادہ وہ تمہارے دین میں سے لے لیں گے"۔ یہ بات جدید بادشاہت کے بارے میں بھی اسی طرح صحیح ہے جیسے وہ قدیم بادشاہت کے بارے میں صحیح تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے وہ دین کا زیادہ حصہ لیتے تھے اور اب وہ آپ کا کل دین لے لیتے ہیں۔

ایک بڑے تاجر نے ایک مرتبہ کہا کہ موجودہ زمانے میں بالکل جائز طریقہ پر کوئی بڑا کاروبار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں آپ کی آمدنی ایک خاص حد سے آگے بڑھی، بے شمار قوانین آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ آپ مجبور ہوتے ہیں کہ غلط طریقے سے کام کریں۔ ورنہ آپ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ "اتنے بڑے کاروبار کا آپ کو مکلف کس نے کیا ہے" جواب دینے والے نے جواب دیا۔ مگر موجودہ انسان کو اس قسم کے جوابات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے تو یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ اپنے امکان بھر ان تمام نعمتوں کو حاصل کرے گا جو خدا نے زمین پر پیدا کی ہیں۔ اس لئے یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو اپنے لئے حلال کرے جس کو خدا نے حرام ٹھیرایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترقی کا ہر واقعہ جو آپ کو اپنے گرد و پیش نظر آتا ہے، وہ صرف حکمت زہد سے محرومی کا ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی بڑھتے بڑھتے خدا کی حرام کی ہوئی چراگاہ میں گھس گیا ہے۔ اس کے بغیر وہ اتنی غیر معمولی فربہی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

ممکن ہے یہ باتیں سن کر آپ کہیں کہ اسلام کا مطلب اگر یہی ہے تو اس کا پانا بہت مشکل ہے۔ بیشک اسلام کا

پانا بہت مشکل ہے مگر وہ خدا کی مدد سے آسان ہو سکتا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے جب روح دین کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو"، تو ان کے شاگرد یہ سن کر بہت اچنبھے میں پڑ گئے اور کہنے لگے کہ پھر کون نجات پا سکتا ہے۔ آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا —— "یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے"۔ اگر آپ اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ وہ حیات طیبہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے تو اس کو پانے کی صورت یہی ہے کہ آپ اسے خدا سے مانگیں۔ دوسری تمام چیزوں کی طرح یہ سب سے قیمتی چیز بھی آپ کو خدا ہی سے ملے گی۔ کہیں اور سے آپ اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر یاد رکھئے خدا سے مانگنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دعا کے کچھ مقرر الفاظ یاد کر لیں اور اسے اپنی زبان سے دہرا دیا کریں ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں:۔

God is not a Cosmic bell-boy for whom we can press a button to get things.

خدا سے مانگنے کی اصل زبان وہ نہیں جو لفظوں کی صورت میں اپنے مطالبات کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے مانگنے کی زبان آپ کا قلب ہے۔ آپ اپنی حقیقی زندگی سے جو کچھ چاہ رہے ہیں وہی دراصل آپ اپنے رب سے مانگتے ہیں۔ خدا آپ کے لفظوں کو نہیں دیکھتا، وہ خود آپ کو دیکھتا ہے۔ آپ اپنے اصل وجود میں جس چیز کے لئے بے قرار ہوں اپنے رب سے آپ اسی چیز کے طلب گار ہیں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دیدے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو نسیان میں مبتلا کر دے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے، آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دینداری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی تاریک کوٹھری میں بند کر دے —— آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو ظاہر ہے کہ پیسے خرچ کرنے کے باوجود آپ خالی ہاتھ واپس لوٹیں گے۔ اسی طرح اگر زبان سے آپ دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں مگر آپ کی اصل ہستی کسی اور طرف متوجہ ہو تو میں کہوں گا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا۔ جو مانگے وہ کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ یاد رکھئے، یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے سارے خزانے کے ساتھ آپ کے قریب ترین آکر آواز دیتا ہے۔ "کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں"، مگر جنھیں لینا ہے وہ سوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

■

—— تقریر حلقہ وار اجتماع جماعت اسلامی ہند بمقام جون پور - ۱۲ نومبر ۱۹۶۱

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

ماہنامہ الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۱۔ مقام اشاعت جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۲۔ وقفہ اشاعت ماہانہ

۳۔ نام پرنٹر (طابع) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۴۔ نام پبلشر (ناشر) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

۶۔ نام اور پتہ مالک رسالہ ثانی اثنین خاں

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

میں ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں، میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں

یکم مارچ ۱۹۷۹ء

ملی تعمیر کا کام

سب سے پہلے

ملت کے افراد میں

شعور پیدا کرنے کا کام ہے

اس کی

بہترین صورت یہ ہے کہ

الرسالہ کو

ایک ایک بستی اور

ایک ایک گھر میں

پہنچایا جائے۔